اہلِ سنت کا تصورِ ''سنت''

حافظ محمد زبیر

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کے امتحان کے لیے ان کو مختلف آزمائشوں سے دوچار کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کوئی نعمت ہی اس کے بندوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے' جیسا کہ مال اور اولاد کے بارے میں قرآن میں مذکور ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ سے علومِ حدیث وسنت کے احیاء کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ مختلف اَدوار سے گزرتی رہی۔ اسی تحریک کی وجہ سے علماء نے حدیث' تاریخ اور سیرتِ رسول ﷺ و صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے متعلقہ سینکڑوں کتب کے تراجم کیے تاکہ عامۃ الناس اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث' سیرت' حیاتِ صحابہؓ اور تاریخ اسلام سے واقف ہو سکیں۔ بلاشبہ علماء کا یہ کام ایک علمی اور نفع بخش کام تھا۔ لیکن جہاں ایک کام میں خیر کے پہلو ہوتے ہیں وہاں کچھ مفاسد بھی اس سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ مصادرِ اسلامیہ سے متعلق ان سینکڑوں کتب کے تراجم کا ایک بڑا نقصان جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سامنے آیا' وہ یہ ہے کہ عامۃ الناس میں بعض افراد نے ان مترجم کتب کے جزئی مطالعہ کے بعد اپنے آپ کو درجۂ اجتہاد و افتاء پر فائز سمجھا اور مفکرِ اسلام کی نشست سنبھالتے ہوئے اسلام کی چودہ صد سالہ علمی تاریخ و روایت کو کارِ عبث قرار دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت وحدیث کے حوالے سے بھی معاصر معاشروں میں ہمیں سینکڑوں ایسے افکار و نظریات نظر آتے ہیں جو کہ راہِ اعتدال سے بہت دُور ہیں' مثلاً قادیانی' نیچری' پرویزی اور جماعت المسلمین وغیرہ۔ بعض مفکرین نے ایک انتہا پر جاتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کی کسی قسم کی تشریعی حیثیت ہی کو ماننے سے انکار کر دیا تو دوسری طرف ایسے گروہ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے آپؐ کے ہر ہر قول اور فعل کو یکساں درجے کا سمجھ کر شریعت سمجھ لیا۔ اس مضمون میں ہمارے پیشِ نظر اس وقت دوسرے گروہ کے افراد ہیں۔ ہمارے نزدیک اگر پہلا گروہ منکرین حدیث کا ہے تو دوسرا 'غالین فی السنۃ' کا ہے۔ یہ حضرات سنت کے مسئلے میں اُس غلو میں مبتلا ہیں جس سے آپؐ نے منع کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ حج کے موقع پر فرمایا:

((وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ' فَاِنَّمَا اَھْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ الْغُلُوُّ فِی الدِّیْنِ))[1]

''دین میں غلو سے بچو۔ تم سے پہلی قومیں دین میں غلو کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں''۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کو مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح کہا ہے[2]۔ امام نوویؒ نے بھی اس کو

مسلم کی شرائط پر صحیح کہا ہے۔[۳] علامہ البانیؒ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے[۴]۔

ایک مثبت رویہ تو یہ ہے کہ ایک شخص اگر حدیث کی مترجم کتابوں سے استفادہ کرتا ہے اور اس دوران اسے کچھ اشکالات پیش آتے ہیں تو وہ ﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ کے قرآنی حکم کے مطابق علماء سے رجوع کر کے ان سے رہنمائی حاصل کرے۔ اگر معاصر علماء سے وہ مطمئن نہیں ہے تو ٹھوس علمی بنیادوں پر علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کرے۔ قرآن، حدیث، فقہ المقارن، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، عقیدہ، علوم بلاغت اور علوم لغت وغیرہ میں پختگی حاصل کرے اور عربی زبان میں موجود ائمہ سلف کے علمی ذخیرے سے براہِ راست استفادہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان بنیادی دینی علوم سے ناواقف ہو اور پھر بھی دین کے معاملات میں اپنی رائے پیش کرے تو ایسے شخص کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ علماء کو اٹھا لیں اور لوگوں کی صورت حال یہ ہوگی:

((اِتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا))[۵]

''لوگ جہلاء کو اپنا بڑا بنالیں گے اور ان جاہلوں سے سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتوے جاری کریں گے۔ پس خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے''۔

یہ اسی زمانے کی علامات ہیں کہ علماء کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اٹھا رہے ہیں اور ترجمہ شدہ کتابوں کا جزئی طور پر مطالعہ کرنے والے فتوے جاری کرنے لگے ہیں۔ علم دین کے حصول میں سند اور استاد کی کیا اہمیت ہے، اس کی ان شاء اللہ ایک مستقل مضمون میں وضاحت کروں گا۔ فی الحال اصل مقصود اس فکر کا جائزہ لینا ہے کہ کیا اللہ کے رسول ﷺ کا ہر ہر قول اور فعل سنت ہے یا نہیں؟

اہل سنت کے ہاں 'سنت' کی تعریف

سنت کا لغوی معنیٰ 'راستہ' یا 'طریقہ' ہے۔ ابن منظور الافریقیؒ لکھتے ہیں:

والسنة السيرة حسنة كانت أو قبيحة ... وفي الحديث :((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً.....)) يريد من عملها ليقتدى به فيها وكل من ابتدأ أمرا عمل به قوم بعده قيل هو الذى سنه[۶]

''سنت سے مراد طریقہ ہے، چاہے اچھا ہو یا برا ہو... اور حدیث میں ہے کہ ''جس نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور جس نے اس (طریقے) پر عمل کیا تو اس (جاری کرنے والے) کے لیے بھی اس کا اجر ہے۔ اور جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا.....'' مراد یہ ہے کہ جس نے اس برے طریقے پر عمل کیا تاکہ اس (طریقے) میں اس کی پیروی کی جائے اور ہر وہ شخص جو کہ پہلی مرتبہ کوئی کام کرتا ہے اور اس کے بعد آنے والوں نے اس پر عمل کیا تو کہا گیا ہے کہ اس نے اسے جاری کیا''۔

علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں:

والسنة السيرة حسنة كانت أو قبيحة' وقال الأزهرى السنة الطريقة المحمودة المستقيمة' ولذلك قيل فلان من أهل السنة' معناه من أهل الطريقة المستقيمة المحمودة (۷)

''سنت سے مراد طریقہ ہے چاہے اچھا ہو یا برا' جبکہ علامہ ازہریؒ کا قول یہ ہے کہ سنت سے مراد پسندیدہ اور سیدھا رستہ ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص 'اہل سنت' میں سے ہے' یعنی سیدھے اور پسندیدہ رستے پر ہے''۔

علامہ ابن الاثیر الجزریؒ فرماتے ہیں:

والأصل فيها الطريقة و السيرة..... وفى حديث المجوس :((سُنُّوْا بِهِمْ سُنَّةَ اَهْلِ الْكِتَابِ)) أى خذوهم على طريقهم و أجروهم فى قبول الجزية منهم مجراهم (۸)

''اس کا اصل معنی طریقہ اور رستہ ہے..... مجوس کے بارے میں آپؐ کی حدیث کے الفاظ ہیں: ''ان کے بارے میں اہل کتاب کی سنت (طریقہ) جاری کرو'' یعنی ان سے بھی اہل کتاب کی طرح جزیہ وصول کرو''۔

امام راغبؒ لکھتے ہیں:

وسنة النبى ﷺ طريقته التى كان يتحراها (۹)

''سنت نبویؐ سے مراد آپؐ کا وہ طریقہ ہے کہ جس کا آپؐ قصد کرتے تھے۔'' ☆

امام ابن فارسؒ لکھتے ہیں:

السنة و هى السيرة و سنة رسول الله سيرته (۱۰)

''سنت کا معنی طریقہ ہے اور سنت رسول ﷺ سے مراد آپؐ کا طریقہ ہے''۔

سنت کا اصطلاحی مفہوم

فقہاء' اصولیین' محدثین اور علمائے متکلمین نے سنت کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان علماء کا سنت کی تعریف میں یہ اختلاف' اختلافِ تضاد نہیں ہے بلکہ تنوع کا اختلاف ہے۔ علماء کی ہر جماعت نے اپنے میدان' موضوع اور اس کے دائرہ کار کے اعتبار سے سنت کی تعریف کی ہے اور ان میں ہر جماعت دوسری جماعت کی سنت کی تعریف کو بھی مانتی اور قبول کرتی ہے۔

☆ قصد سے امام راغبؒ کی یہاں پر مراد قرب الٰہی کا قصد ہے' جیسا کہ بعض اصولیین نے اس کی وضاحت کی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو بھی کام آپؐ نے قرب الٰہی کے قصد و ارادے سے کیا ہو وہ سنت ہے۔

متکلمین کے نزدیک سنت کا مفہوم

علم عقیدہ اور علم فقہ میں سنت کا لفظ بدعت کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔ لہٰذا عقائد و فقہ کی کتب میں جب بعض اوقات یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''یہ عمل سنت ہے'' تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ بدعت نہیں ہے۔ اسی لیے 'اہل سنت' کا لفظ 'اہل بدعت' کا متضاد ہے اور اہل سنت سے مراد وہ جماعت ہے جو کہ اہل بدعت نہیں ہیں۔ الدکتور وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وقد تطلق على ما يقابل البدعة كقولهم: فلان من أهل السنة(۱۱)

''اور بعض اوقات (سنت) کا لفظ بدعت کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ علماء کہتے ہیں فلاں شخص اہل سنت میں سے ہے''۔

اہل سنت کا لفظ اہل بدعت مثلاً معتزلہ، جہمیہ، خوارج، مرجئہ، شیعہ، جبریہ اور قدریہ وغیرہ کے بالمقابل عقیدے کی ایک اصطلاح ہے۔ اہل سنت سے مراد تین گروہ ہیں: اشاعرہ، ماتریدیہ اور سلفیہ یا اثریہ۔ شوافع اور مالکیہ کی اکثریت عقیدے کے اعتبار سے اشاعرہ ہیں۔ اس جماعت کو امام ابوالحسن الأشعری (متوفی ۳۲۴ھ) کی طرف نسبت کی وجہ سے اشاعرہ کہا گیا۔ احناف کی اکثریت ماتریدی عقائد کی حامل ہے۔ یہ حضرات امام ابومنصور ماتریدی (متوفی ۳۳۳ھ) کی طرف نسبت سے اپنے آپ کو ماتریدیہ کہتے ہیں۔ جبکہ حنابلہ اور اہل الحدیث (محدثین) سلفیہ یا اثریہ کہلاتے ہیں۔ یہ اپنے عقائد کی نسبت سلف صالحین صحابہ، تابعین اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی طرف کرتے ہیں، اس لیے یہ جماعت اپنے گروہ کو سلفیہ یا اثریہ کہتی ہے۔ اہل سنت کے ان تینوں گروہوں کے عقائد میں فرق زیادہ تر صفاتِ باری تعالیٰ کے مسئلے میں ہے۔ اہل سنت کے یہ تین گروہ عقائد کے باب میں ہیں، جبکہ فقہ میں اہل سنت کے گروہوں میں احناف، مالکیہ، شوافع، حنابلہ، اہل الحدیث (محدثین) اور اہل الظواہر شامل ہیں۔

فقہاء کے نزدیک سنت کی تعریف

علم الفقہ میں سنت کا لفظ فرض کے بالمقابل استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جب فقہاء کسی فعل کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ سنت ہے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ فرض نہیں ہے۔ الدکتور وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

والسنة عند الفقهاء: هي ما يقابل الواجب من العبادات(۱۲)

''فقہاء کے نزدیک سنت سے مراد وہ چیز ہے جو کہ عبادات سے متعلق ہو اور واجب (یعنی فرض) نہ ہو''۔

عام طور پر اس سنت (یعنی جو فرض نہیں ہے) کو مندوب بھی کہتے ہیں۔ الدکتور عبدالکریم زیدان 'مندوب'

کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والمندوب: المدعو إليه..... وفي الاصطلاح: هو ما طلب الشارع فعله من غير الزام، بحيث يمدح فاعله و يثاب، ولا يذم تاركه، ولا يعاقب، وقد يلحقه اللوم والعتاب على ترك بعض أنواع المندوب..... والمندوب يسمى أيضا: السنة، و النافلة، والمستحب، والتطوع، والاحسان، والفضيلة[۱۳]

''مندوب کا لغوی معنی ہے جس کی طرف بلایا جائے...اور اصطلاحی معنی میں ہر اُس کام کو مندوب کہیں گے جس کے کرنے کا شارع نے مطالبہ کیا ہو لیکن اس کو لازم نہ ٹھہرایا ہو۔ جو شخص یہ کام کرے گا وہ قابل تعریف ہوگا اور اس کو ثواب بھی ملے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مندوب کو چھوڑ دے گا تو نہ تو اس کو ملامت کی جائے گی اور نہ ہی اس کو سزا دی جائے گی۔ تاہم مندوب کی بعض قسمیں ایسی ہیں کہ جن کے چھوڑنے پر ملامت بھی کی جائے گی اور سزا بھی ہوگی.....مندوب کو علماء کے ہاں سنت، نفل، مستحب، تطوع، احسان اور فضیلت بھی کہتے ہیں''۔

فقہاء نے عام طور پر مندوب کو تین طرح سے تقسیم کیا ہے اور ہر قسم کا الگ الگ حکم بھی بیان کیا ہے۔ مندوب کی پہلی قسم 'سنت مؤکدہ' کہلاتی ہے۔ الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

والمندوب ليس نوعا واحدا، بل هو على مراتب: فأعلاها ما واظب عليه النبي ﷺ ولم يتركه إلا نادرا، و منه: صلاة ركعتين قبل فريضة الفجر، فهذه تسمى: سنة مؤكدة، يلام تاركها و لا يعاقب[۱۴]

''مندوب کی ایک قسم نہیں ہے، بلکہ اس کی کئی اقسام ہیں۔ مندوب کی سب سے اعلیٰ قسم وہ ہے جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے مداومت کی ہو اور اس کو شاذ و نادر ہی کبھی ترک کیا ہو۔ اس کی مثال فجر کی فرض نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا ہے۔ اس کو سنت مؤکدہ کہتے ہیں۔ اس کے چھوڑنے والے کو ملامت کی جائے گی لیکن اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی''۔

مندوب کی دوسری قسم 'سنت غیر مؤکدہ' کہلاتی ہے۔ الدکتور وھبہ الزحیلی اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفاعله يثاب و تاركه لا يستحق عقابا ولا عتابا ولا لوما، كالأمور التي لم يواظب عليها الرسول ﷺ، وإنما فعلها مرة أو أكثر وتركه، مثل صلاة أربع ركعات قبل صلاة العشاء ..... و يسمى هذا الفعل فضلا أو مستحبا[۱۵]

''اس پر عمل کرنے والے کو ثواب ہوگا اور اس پر عمل نہ کرنے والے کو نہ تو ملامت کی جائے گی اور نہ ہی دنیا و آخرت میں کوئی سزا ہوگی۔ یہ وہ فعل ہے جسے آپ ﷺ نے ایک یا ایک سے زائد مرتبہ کیا ہو اور اسے ترک بھی کیا ہو، مثلاً نماز عشاء سے پہلے چار رکعتیں پڑھنا.....اس قسم کو فضل یا مستحب بھی کہتے ہیں''۔

مندوب کی تیسری قسم 'مندوب زائدہ' یا 'عادت' کہلاتی ہے۔ اس کو بعض علماء 'سنت زائدہ' بھی کہہ دیتے ہیں۔ الدکتور وھبہ الزحیلی اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مندوب زائد: أی من الكماليات للمكلف' كالأمور العادية التى فعلها الرسول ﷺ بحسب العادة' كالاقتداء بأكل الرسول و شربه و اتباع طريقته فى مشيه و نو مه و لبسه ونحو ذلك ..... و يسمى هذا القسم سنة زواند و مستحبا و أدبا و فضيلة وحكمه كما يلاحظ أن تاركه لا يستحق اللوم و العتاب' و فاعله يستحق الثواب إذا قصد به الاقتداء بالرسول ﷺ(۱۶)

''مندوب کی تیسری قسم 'مندوب زائد' ہے جو کہ مکلّف کے کمال سے متعلق ہے۔ اس کی مثال وہ عادی امور ہیں جن کو آپؐ نے حسب عادت کیا۔ مثلاً آپؐ کے کھانے' پینے اور آپؐ کے چلنے' سونے اور پہننے کے طریقوں وغیرہ میں آپؐ کی پیروی کرنا..... اس قسم کو سنت زائدہ' مستحب' ادب اور فضیلت بھی کہتے ہیں۔ مندوب کی اس قسم کا حکم یہ ہے کہ اس کے ترک کرنے والے کو نہ ہی ملامت کی جائے گی اور نہ ہی سزا دی جائے گی اور اس پر عمل کرنے والے کو اس کا ثواب ملے گا بشرطیکہ اس کی نیت آپؐ کی اقتداء کی ہو''۔

مندوب زائد کو سنت زائدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ سنت دین نہیں ہے' بلکہ دین سے زائد ہے' لیکن اگر پھر بھی کوئی شخص آپؐ کی اتباع کی نیت سے اس پر عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ آپؐ سے محبت کے اس جذبے پر اسے اجر و ثواب دیں گے۔ سنت زائدہ کو دین یا شریعت اسلامیہ کا جز و سمجھنا جہالت اور غلو فی السنۃ ہے۔ مندوب زائد یا سنتِ زائدہ یا آپؐ کے عادی اُمور جو کہ آپؐ نے بشری تقاضوں کے تحت سرانجام دیے' دین اسلام کا حصہ نہیں ہیں۔ آگے چل کر احادیث کے حوالے سے ہم اس موضوع پر مفصل بحث کریں گے۔ الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

أنها ليست من أمور الدين' ولم تجر مجرى العبادات' ولكن مجرى العادات(۱۷)

''سنت زائدہ امور دین میں سے نہیں ہے اور نہ ہی سنت کی یہ قسم عبادت کے طور پر جاری ہوئی ہے' بلکہ یہ عادت کے طور پر جاری ہوئی ہے''۔

محدثین کے ہاں سنت کی تعریف

محدثین کے نزدیک سنت اور حدیث قریباً مترادف ہیں۔ سنت اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال' افعال' تقریرات اور پیدائشی و اکتسابی اوصاف کا نام ہے۔ جبکہ ان چاروں چیزوں کی آپؐ کی طرف نسبت حدیث کہلاتی ہے۔ یعنی آپؐ کے کسی قول' فعل' تقریر یا صفت کو جب کوئی صحابیؓ اللہ کے رسول کی طرف منسوب کرتا ہے تو صحابیؓ کی آپؐ کی طرف اس نسبت کو حدیث کہتے ہیں۔ سنت اگر اللہ کے رسول ﷺ

کے اقوال' افعال' تقریرات اور اوصاف کا نام ہے تو حدیث اس کی روایت ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سنت اور حدیث میں کچھ فرق نہیں ہے۔حدیث میں آپؐ کے اقوال' افعال' تقریرات اور اوصاف کے حوالے سے جو کچھ بیان ہو رہا ہے وہ سنت ہے۔یہی وجہ ہے کہ حدیث کی امہات الکتب میں سے اکثر کے نام سنن سے شروع ہوتے ہیں' مثلاً سنن ابی داؤد' سنن نسائی' سنن ابن ماجہ وغیرہ۔سنت اور حدیث میں ایک فرق یہ ہے کہ حدیث کا لفظ سنت کی نسبت عام ہے' کیونکہ حدیث کا مقصود آپؐ کی زندگی سے متعلق جمیع حالات' واقعات' اقوال اور افعال وغیرہ کو جمع کرنا ہے چاہے وہ بعثت سے پہلے آپؐ سے صادر ہوں یا بعثت کے بعد ہوں۔جبکہ سنت صرف آپؐ کے ان اقوال و افعال و تقریرات وغیرہ پر مشتمل ہوگی جو کہ آپؐ سے بطور شریعت صادر ہوں۔اس پہلو سے غالب وصف کا اعتبار کرتے ہوئے احادیث کی کتب کو سنن کہا گیا ہے۔الدکتور حمزۃ الملیباری سنت و حدیث کے اس باریک فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

السنة في الاصطلاح ما هو عن رسول اللهﷺ على وجه التشريع من قول أو فعل أو تقرير أو صفة خلقية من مبدأ بعثته إلى وفاته' الحديث النبوى ما أضيف إلى النبيﷺ من قول أو فعل أو تقرير أو صفة خلقية أو خلقية سواء قبل البعثة أم بعدها سواء صدر على وجه التشريع أم لا و يطلق تجوزا على ما أضيف إلى الصحابة والتابعين وعليه يكون الحديث أعم من السنة فان السنة لا تشمل إلا ما صدر عن النبيﷺ على وجه التشريع(۱۸)

''اصطلاح میں سنت سے مراد ہر وہ قول یا فعل یا تقریر یا اکتسابی وصف ہے جو کہ رسول اللہﷺ سے آپؐ کی بعثت کے بعد سے لے کر وفات تک کے دورانیے میں بطور شریعت صادر ہوا ہو۔جبکہ حدیث نبویؐ سے مراد ہر وہ قول' فعل' تقریر' پیدائشی یا اکتسابی وصف ہے کہ جس کی نسبت نبی کریمﷺ کی طرف کی گئی ہو' چاہے یہ بعثت سے پہلے ہو یا بعد میں ہو' چاہے بطور شریعت صادر ہوا ہو یا شریعت نہ ہو۔مجازاً اس کا اطلاق صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال' افعال' تقریرات اور اوصاف پر بھی ہو جاتا ہے۔پس اس پہلو سے حدیث' سنت کی نسبت عام ہے' کیونکہ سنت سے مراد صرف وہی امور ہیں جو نبی کریمﷺ سے بطورِ شریعت صادر ہوئے ہوں''۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر حدیث شریعت نہیں ہے۔مثلاً وہ احادیث جو آپؐ کی نبوت سے ماقبل کی زندگی کے حالات و افعال پر مشتمل ہیں یا آپؐ کے پیدائشی اوصاف کو بیان کرنے والی ہیں وغیرہ۔جن احادیث کا تعلق شریعت سے ہے وہ سنت ہیں۔اسی لیے جب بھی شریعتِ اسلامیہ کے مصادر کی بات کی جاتی ہے تو قرآن و سنت کہا جاتا ہے نہ کہ قرآن و حدیث۔دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ آپﷺ کا ہر قول یا فعل سنت نہیں ہے بلکہ وہی اقوال و افعال سنن ہیں جو کہ بطور شریعت آپؐ سے صادر ہوئے ہیں۔اس موضوع پر ہم آگے چل کر مفصل بحث کریں گے۔

اصولیین کے نزدیک سنت کی تعریف

اصولیین کے نزدیک سنت کی تعریف میں الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

وفی اصطلاح الأصولیین' السنة: ما صدر عن النبی ﷺ' غیر القرآن' من قول أو فعل أو تقریر' فهی بهذا الاعتبار دلیل من أدلة الأحکام' و مصدر من مصادر التشریع(۱۹)

''اصولیین کی اصطلاح میں قرآن کے علاوہ رسول اللہ ﷺ سے جو بھی اقوال' افعال اور تقریرات صادر ہوئی ہیں وہ سنت ہیں۔ پس سنت اس اعتبار سے ادلۂ احکام میں سے ایک دلیل ہے اور مصادر شریعت میں سے ایک مصدر ہے''۔

اصولیین کا اصل موضوع یہ ہے کہ کیا چیز شریعت ہے اور کیا چیز شریعت نہیں ہے۔ اس لیے اصولیین نے آپ ﷺ کی صفات کو سنت کی تعریف میں شامل نہیں کیا' کیونکہ اصولیین کے نزدیک آپؐ کے پیدائشی یا اکتسابی اوصاف سے کوئی حکم شرعی مستنبط نہیں ہوتا' جبکہ محدثین کے نزدیک آپؐ کے اکتسابی اوصاف سے بھی کوئی شرعی حکم نکل سکتا ہے' لہٰذا انہوں نے اکتسابی اوصاف کو بھی سنت کی تعریف میں داخل کر دیا ہے۔ فقہاء کے مختلف طبقات نے مختلف پہلوؤں سے سنت کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالی ہے اور اِن معانی میں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' کوئی تضاد نہیں۔ فقہاء' محدثین اور اصولیین کے نزدیک سنت کا اطلاق صرف انہی امور پر ہوگا جو کہ آپ ﷺ سے بطور شریعت صادر ہوئے ہیں۔

ہمارے بعض دوستوں کا یہ خیال ہے' جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں' کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ہر قول و فعل سنت ہے' لہٰذا اس کی پیروی کرنی چاہیے' کیونکہ قرآن میں ہمیں آپؐ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا آپ ﷺ کا ہر قول اور فعل سنت ہے اور ہمارے لیے قابل تقلید نمونہ ہے؟ ہم اس سوال کا جواب براہ راست احادیث' صحابہؓ اور تابعینؒ کے طرز عمل میں تلاش کریں گے۔ ہم یہاں پر محدثین اور اصولیین کی اصطلاح کے اعتبار سے اپنی بحث کو آگے بڑھائیں گے اور یہ واضح کریں گے کہ آپ ﷺ کے اقوال' افعال اور تقریرات وغیرہ میں کیا سنت (یعنی شریعت) ہے اور کیا سنت (یعنی شریعت) نہیں ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال

اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال کی حیثیت سے اصولی طور پر یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ آپ ﷺ کا ہر قول شریعت ہے بشرطیکہ وہ تشریع کے لیے آپؐ سے صادر ہوا ہو۔ کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم)

''اور وہ (نبی ﷺ) اپنی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتے۔ (اور جو بھی وہ کلام کرتے ہیں) وہ وحی ہی ہوتی ہے جو کہ وحی کی جاتی ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

كُنْتُ اَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ اَسْمَعُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اُرِيْدُ حِفْظَهُ فَنَهَتْنِيْ قُرَيْشٌ وَقَالُوْا اَتَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ تَسْمَعُهُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَا، فَاَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَوْمَاَ بِاُصْبُعِهٖ اِلٰى فِيْهِ فَقَالَ: ((اُكْتُبْ فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا حَقٌّ)) (۲۰)

''میں اللہ کے رسول ﷺ سے سنی ہوئی ہر بات لکھا کرتا تھا جس کو یاد رکھنے کا میرا ارادہ ہوتا تھا تو قریش کے بعض افراد نے مجھے ہر بات لکھنے سے منع کیا اور کہا: کیا جو بھی تم اللہ کے رسول ﷺ سے سنتے ہو اسے لکھ لیتے ہو؟ حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ ایک بشر ہیں، بعض اوقات آپ ناراضگی میں کلام فرماتے ہیں اور بعض اوقات رضامندی کی حالت میں۔ (حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ) میں ان صحابہؓ کی یہ بات سن کر اپنے اس فعل سے رک گیا، لیکن میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس بات کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''لکھو! اللہ کی قسم اس زبان سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا۔''

امام ابن حجرؒ نے اس حدیث کو قابل احتجاج قرار دیا ہے۔ (۲۱) علامہ البانیؒ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ (۲۲)

قرآن کی مذکورہ بالا آیت اور اس قسم کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو کلام بھی شرع بیان کرنے کے لیے کیا ہے وہ حق ہے، حجت ہے، وحی ہے اور قابل اتباع ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا ہر قول کسی شرعی حکم کو بیان کرنے کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات آپؐ ہماری طرح دنیاوی اُمور میں بھی گفتگو کرتے تھے اور آپ ﷺ کا یہ کلام کسی شرعی حکم کے استنباط کے لیے مصدر کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

وأقوال النبي ﷺ إنما تكون مصدرا للتشريع، إذا كان المقصود بها بيان الأحكام أو تشريعها، أما إذا كانت في أمور دنيوية بحته لا علاقة لها بالتشريع، ولا مبنية على الوحي، فلا تكون دليلا من أدلة الأحكام، و لا مصدرا تستنبط منه الأحكام الشرعية، و لا يلزم اتباعها، ومن ذلك ما روى: أنه عليه السلام رأى قوما في المدينة يؤبرون النخل، فأشار عليهم بتركه، ففسد الثمر، فقال لهم: ((اَبِرُوْا اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ)) (۲۳)

''اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال صرف اُس وقت مصدرِ شریعت ہوں گے جب ان سے آپ کا مقصود احکامِ شرعیہ کو بیان کرنا ہو۔ لیکن اگر آپؐ نے بعض دنیاوی امور کے بارے میں کچھ گفتگو ایسی فرمائی

جس کا شریعت سے کوئی تعلق نہ ہو تو آپ ﷺ کا ایسا کلام احکامِ شرعیہ کے لیے کوئی دلیل نہیں بنے گا اور نہ ہی وہ مصدر شریعت ہوگا کہ جس سے احکام نکالے جائیں' اور نہ ہی آپؐ کے ایسے اقوال کی پیروی لازمی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ کے بعض لوگوں کو دیکھا کہ وہ نر کھجور کے ساتھ مادہ کھجور کی پیوند کاری کرتے تھے۔ آپؐ نے لوگوں کو ایسا کرنے سے اشارتاً منع کر دیا جس کہ وجہ سے اگلی فصل کم ہوئی تو آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ: ''پیوند کاری کرو' کیونکہ دنیاوی امور کو تم زیادہ بہتر جانتے ہو''۔

اس موضوع پر کہ ''آپؐ کا ہر قول ہمارے لیے شریعت نہیں ہے'' شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' میں 'المبحث السابع: مبحث استنباط الشرائع من حدیث النبی ﷺ' کے تحت مختصر لیکن بہت عمدہ بحث کی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک آپؐ کے وہ اقوال جو تبلیغِ رسالت کے باب سے نہیں ہیں (یعنی دنیاوی امور سے متعلق ہیں)' بعض حضرات کے مناقب سے متعلق اقوال' طب سے متعلق بعض اقوال' آپؐ کے دور میں کسی جزئی مصلحت کے حصول کے لیے آپؐ کے جاری کردہ احکامات' آپؐ کے عادی امور' آپؐ کے فیصلے (یعنی قضاء) اور آپؐ کے بعض احکامات کا آپ کی قوم کے بعض لوگوں کے لیے خاص ہونا وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس موقف کی دلیل کے طور پر کہ آپ کا ہر قول ہمارے لیے شریعت نہیں ہے' ایک حدیث کو بیان کیا ہے۔ حضرت خارجہ بن زید بن ثابتؓ سے روایت ہے:

دَخَلَ نَفَرٌ عَلٰی زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالُوْا حَدِّثْنَا بَعْضَ حَدِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ وَمَا أُحَدِّثُکُمْ؟ کُنْتُ جَارَہٗ فَکَانَ إِذَا نَزَلَ الْوَحْیُ أَرْسَلَ إِلَیَّ فَکَتَبْتُ الْوَحْیَ وَکَانَ إِذَا ذَکَرْنَا الْآخِرَۃَ ذَکَرَھَا مَعَنَا وَإِذَا ذَکَرْنَا الدُّنْیَا ذَکَرَھَا مَعَنَا وَإِذَا ذَکَرْنَا الطَّعَامَ ذَکَرَہٗ مَعَنَا' فَکُلُّ ھٰذَا أُحَدِّثُکُمْ عَنْہُ؟ (۲۴)

''لوگوں کی ایک جماعت حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس آئی اور انہوں نے کہا: آپ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کی بعض حدیثیں بیان کریں' تو حضرت زیدؓ نے کہا: میں تمہارے سامنے کون سی حدیثیں بیان کروں؟ میں اللہ کے رسول ﷺ کے پڑوس میں رہتا تھا۔ پس جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ مجھے بلوا لیتے اور میں اس وحی کو لکھ لیتا تھا اور (اللہ کے رسول ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ) جب ہم آخرت کا تذکرہ کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ آخرت کی باتیں کرتے تھے اور جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ دنیا کی باتیں کرنے لگتے' اور جب ہم کھانے پینے کے بارے میں گفتگو کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ کھانے پینے کی باتوں میں شریک ہو جاتے۔ پس کیا میں یہ سب حدیثیں تم سے بیان کروں؟''

امام ہیثمیؒ نے اس روایت کو 'حسن' کہا ہے۔ (۲۵) امام ابن حجرؒ نے اس روایت کو 'حسن' کہا ہے۔ (۲۶) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی اس روایت سے حجت پکڑی ہے۔ علامہ البانیؒ نے اس روایت کو

'ضعیف' کہا ہے(۲۷)۔

'سنن البیھقی' کی ایک روایت میں 'أَوَكُلَّ هٰذَا نُحَدِّثُكُمْ عَنْهُ'؟ کے الفاظ بھی ہیں۔ بعض اصحاب کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ہر قول پر عمل ضروری ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ قرآن میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا اور آپؐ کی اطاعت اُمت پر لازم ہے' لہٰذا جہاں بھی آپ کا کوئی قول آجائے تو اس پر عمل کرنا لازم ہوگا' کیونکہ آپؐ کے اقوال آپؐ کی اطاعت میں داخل ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا اور آپ کی اطاعت ہر اُمتی پر فرض ہے' لیکن کیا آپ کا ہر ہر قول اطاعت کی تعریف میں داخل ہے؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو یہ موقف غلط ہے۔

اطاعتِ رسول ﷺ کا معنی و مفہوم اور شرعی حکم

اطاعت سے کیا مراد ہے؟ معروف لغوی ابن سیدہؒ نے اطاعت کی تعریف 'لَانَ وَانْقَادَ' سے کی ہے' یعنی نرم و لچکدار ہونا اور تابع بننا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مزاحمت (resistance) ترک کر کے کسی کی بات ماننا اور اس کا فرماں بردار ہونا اطاعت ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بلوا کر کہا: أَطِعْ أَبَاكَ یعنی مزاحمت ترک کر کے اپنے اندر لچک پیدا کر اور اپنے باپ کی بات مان لے۔ لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے مراد آپؐ کے مقابلے میں ہر قسم کی مزاحمت ترک کر کے آپؐ پر ایمان لانا اور آپؐ کی بات ماننا ہے۔

قرآن میں اطاعت کا لفظ کفار اور اہل ایمان دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے' لیکن دونوں کے لیے اس کے معنی میں باریک فرق ہے۔ قرآن میں جب کفار' مشرکین' اہل کتاب اور منافقین سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس سے مراد رسولؐ کے بالمقابل مزاحمت ترک کر کے ان پر ایمان لانے میں ان کی بات ماننا ہے۔ جیسا کہ حضرت نوح' حضرت صالح' حضرت ہود' حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم کو ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۝﴾ (الشُّعراء: ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۳، ۱۷۹) کا حکم جاری کیا۔ ان آیات میں اطاعت سے مراد نبی پر ایمان لانے میں اس کی بات ماننا ہے' کیونکہ ایک شخص رسول کو رسول مانتا ہی نہ ہو تو اس سے اس چیز کا مطالبہ کرنا کہ وہ رسول کے احکامات پر عمل کرے' عبث ہے' اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی رسول کی ایسی اطاعت کا منکر کافر ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

الْكٰفِرِيْنَ﴿۳۲﴾ (آل عمران) میں اطاعت سے مراد رسول کے ایمان لانے کے مطالبے میں اس کی اطاعت ہے۔ امام سیوطیؒ نے 'تفسیر جلالین' میں اس آیت کی تقدیر عبارت یوں بیان کی ہے: 'قُلْ (لهم) اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (فيما يأمركم به من التوحيد) فَاِنْ تَوَلَّوْا (أعرضوا عن الطاعة) فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ جمہور مفسرین امام ابن جریر طبری' امام رازی' امام قرطبی' امام بیضاوی' امام بغوی' امام ابن عطیہ' علامہ ابن جوزی' امام ابو حیان الاندلسی' علامہ آلوسی اور علامہ ابو بکر الجزائری رحمہم اللہ نے اپنی تفاسیر میں اس آیت کے شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ آیت مبارکہ نجران کے عیسائی وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کہ اللہ سے محبت کرنے کے دعوے دار تھے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے یہ آیت مبارکہ ان یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ کا دعویٰ کیا ہے۔ ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴿۳۲﴾﴾ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو صرف اللہ کی اطاعت کا دعویٰ کرتے تھے اور آپؐ کی اطاعت کے انکاری تھے۔

ہمارے خیال میں یہ تینوں ہی اس آیت کے شان نزول ہو سکتے ہیں اور اس کے مصداقات بنتے ہیں۔ اگر اس آیت میں اہل کتاب سے خطاب مراد لیا جائے' جیسا کہ جمہور مفسرین کی رائے ہے' تو پھر 'فَاِنْ تَوَلَّوْا' سے مراد ان کا اللہ اور اس کے رسول کے مطالبۂ ایمان میں ان کی بات نہ ماننا ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ایمان کے مطالبے میں ان کی بات سے اعراض کرے تو ایسا شخص بلاشبہ کافر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص منافقین کی طرح صرف اللہ کی اطاعت کا قائل ہو اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا مطلقاً انکاری ہو اور آپ ﷺ کو مُطَاع نہ سمجھتا ہو تو ایسا شخص بھی بلاشبہ دائرۂ اسلام سے خارج اور زندیق ہے۔ لیکن کیا یہ آیت مبارکہ اس شخص کو بھی کافر قرار دیتی ہے جو کہ مؤمن صادق ہے اور آپؐ کی اطاعت کو بھی اللہ کی اطاعت کی طرح فرض سمجھتا ہے لیکن بعض جزوی مسائل میں آپؐ کی اطاعت سے انکاری ہے یا آپؐ کی اطاعت نہیں کرتا؟ اس مسئلے میں اہل سنت کے ہاں تفصیل ہے جس کو ہم جا بجا اس مضمون میں واضح کریں گے۔ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں واضح کیا ہے کہ 'فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ' میں اللہ کے رسول ﷺ کا نافرمان مؤمن صادق داخل نہیں ہے۔

ایک شخص اگر اللہ کی طرح اس کے رسول ﷺ کو بھی مُطاع مانتا ہے لیکن پھر بھی بعض ضروری معاملات میں آپؐ کی اطاعت نہیں کرتا تو ایسا شخص تمام اہل سنت کے نزدیک کافر نہیں ہے' ہاں گناہ گار اور فاسق ہوگا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: میری فلاں بات پر عمل کرو' اگر عمل نہیں کرو گے تو کافر ہو جاؤ گے۔ اب اگر کوئی شخص آپؐ کے اس حکم میں آپؐ کی اطاعت کا قائل تو ہو لیکن آپؐ کی اطاعت نہ کرے تو کیا یہ شخص کافر ہوگا؟ اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھیں کہ اللہ کے

رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ)) (۲۸)

''میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگ جاؤ''۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے جو گروہ میری وفات کے بعد آپس میں قتال کریں گے تو وہ کافر ہو جائیں گے۔ اسی طرح 'مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰہِ فَقَدْ کَفَرَ' اور 'بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ' اور 'إِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِاَخِیْہِ یَا کَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِھَا أَحَدُھُمَا' اور 'سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ' وغیرہ کی طرح کی بہت سی ایسی احادیث مبارکہ موجود ہیں جن میں آپؐ نے اپنے کسی حکم کی خلاف ورزی کو کفر قرار دیا ہے۔ تو کیا ان احکامات میں آپ کی نافرمانی کرنے والا شخص کافر ہے؟ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس طرح کا شخص ایسا کافر نہیں ہے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے اور دائمی جہنمی ہو۔ اہل سنت کا ایک گروہ اس کو 'کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ'' قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسے شخص کا کفر 'عملی کفر' ہے۔ ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور محدثین کا قول یہی ہے۔ جبکہ اہل سنت کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ 'کفر مجازی' ہے، یعنی حقیقی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور بعض فقہاء کا یہی قول ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو عملی کافر کہیں یا مجازی کافر' بہر حال اس بات پر جمیع اہل سنت کا اتفاق ہے کہ ایسا شخص 'کافر حقیقی' نہیں ہے کہ جس سے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو یا آخرت میں دائمی جہنم کا مستحق ہو۔ (۲۹)

اس کے برعکس خوارج اور معتزلہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان احادیث کی وجہ سے گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ خوارج اس کو کافر بھی قرار دیتے ہیں جبکہ معتزلہ کافر نہیں کہتے' لیکن یہ دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ دائمی جہنمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوارج نے صحابہ کرامؓ پر کفر کے فتوے لگائے اور حضرت علیؓ و معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ کے خون کو مباح قرار دیا۔ اگر خوارج اور معتزلہ کا نظریہ مان لیا جائے پھر تو معاذ اللہ! جنگ جمل اور جنگ صفین میں شامل تمام صحابہؓ کافر ہو گئے تھے؟ کیونکہ انہوں نے ((لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ)) میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت نہ کی تھی۔

اب اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر بعض مفسرین مثلاً ابن کثیرؒ وغیرہ نے 'فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ' سے مراد مسلمانوں کا ایک گروہ لیا ہے تو اس سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ مسلمان آپؐ کی جزوی عدم اطاعت سے حقیقی کافر ہو جاتے ہیں' بلکہ ان کی مراد یہاں پر 'کفر دون کفر' اور عملی کفر ہے۔ امام ابن کثیرؒ کے شاگرد ابن ابی العز الحنفیؒ نے 'شرح عقیدہ طحاویہ' میں 'لَا نُکَفِّرُ اَحَدًا بِذَنْبٍ' کے تحت اس موضوع پر کافی مفصل بحث کی ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ 'کفر دون کفر' کی اصطلاح مابعد کے زمانوں کی نہیں ہے' بلکہ اسے سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے استعمال کیا تھا۔

اوپر ہم اس مسئلے کو زیر بحث لائے ہیں کہ ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے ایک حکم کو لازمی حکم مانتا ہے' لیکن آپ ﷺ کی اس حکم میں اطاعت نہیں کرتا تو اس کا کیا حکم ہے؟ صحیح روایات اور ائمہ اہل سنت کی رائے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ایسا شخص عدم اطاعت کے باوجود کافر نہیں ہے۔ اور اگر آپؐ نے اس مسئلے میں اپنی عدم اطاعت کو کفر قرار دیا ہے تو پھر بھی وہ شخص حقیقی کافر نہ ہوگا بلکہ مجازی یا عملی کافر ہوگا' جیسا کہ صحابہؓ بعض ایسے احکامات میں عدم اطاعت کے مرتکب ہوئے ہیں جن کے ارتکاب کو آپؐ نے کفر قرار دیا تھا۔ اب دوسرے مسئلے کی طرف آتے ہیں کہ کوئی مسلمان اللہ کے رسول ﷺ کے کسی لازمی حکم کا انکار کر دے تو اس کا کیا حکم ہے۔ اب اس انکار کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپؐ کے اس لازمی حکم کو منسوخ سمجھتا ہو یا اس کی کوئی ایسی تاویل کرتا ہو کہ وہ لازمی حکم اس کے نزدیک لازمی نہ رہے' مستحب یا مباح کے دائرے میں چلا جائے۔ یا وہ آپؐ کے اس حکم کو بعض حالات یا اسباب کے ساتھ خاص قرار دیتا ہو یا کوئی بھی وجہ نہ ہو اور وہ اس کا انکار کر دے وغیرہ۔ اگر کوئی شخص کسی سنت کو منسوخ سمجھے یا اس کی تاویل کرے یا اس کو بعض حالات واسباب سے خاص قرار دے' تو ایسی صورت میں اس سنت کا منکر اہل سنت کے نزدیک بالاتفاق کافر نہ ہوگا۔ اس باب میں ہم یہاں پر صرف ایک اصولی بات کا ذکر کر دیتے ہیں کہ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص آپؐ کی کسی ایسی لازمی سنت کا انکار کر دے جو کہ خبر واحد سے ثابت ہو تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

حال ہی میں ایک نیا فلسفہ یہ بھی متعارف ہوا ہے کہ کسی فرض کی ادائیگی کا جو طریقہ ہمیں بذریعہ سنت ملتا ہے' فرض کی ادائیگی میں اس طریقے کی پیروی اُمت مسلمہ کے لیے لازم ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس طریقے سے کسی فرض کو ادا نہیں کرتا جس طرح سے سنت میں اس کی ادائیگی کا طریقہ ملتا ہے تو ایسے شخص کا نہ تو وہ فرض ادا ہوگا اور نہ ہی وہ اُخروی نجات حاصل کر سکے گا' کیونکہ فرض کی ادائیگی کا جو طریقہ سنت سے ملتا ہے وہ اطاعت ہے اور آپؐ کی عدم اطاعت کو فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ' میں کفر قرار دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کے حامل حضرات اس کے لیے ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور اس کی ادائیگی کا طریقہ سنت سے ملتا ہے' لہٰذا اگر کوئی سنت کے مطابق یہ فرض ادا نہیں کرتا تو اس کی نماز قبول نہیں ہے اور نہ ہی اس کی نجات ہوگی۔ اسی طرح اقامت دین کی جدوجہد فرض ہے۔ اس کی ادائیگی کا طریقہ سنت سے ملتا ہے' اور جو کوئی (من وعن) اس منہج کے مطابق اقامتِ دین کی جدوجہد کا فریضہ سرانجام نہیں دے رہا جیسے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ملتا ہے' تو ایسے شخص کا یہ فریضہ ادا نہ ہوگا اور نہ ہی اُخروی نجات ہوگی (مثلاً جماعت اسلامی' تبلیغی جماعت' حزب التحریر' علمائے دیوبند' جماعت اہل حدیث' جہادی تحریکیں وغیرہ)۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک یہ تمام گروہ یا تو اقامت دین کا فرض ادا ہی نہیں کر رہے یا اگر ادا کر رہے ہیں تو سیرت کے طریقے کے مطابق ادا نہیں کر رہے۔

اس نقطۂ نظر کے حاملین کو ہمارا جواب یہ ہے کہ جہاں تک نماز کا تعلق ہے تو نماز کو جس طرح فرض قرار دیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) کے ذریعے اس کا سنت کے مطابق پڑھنا بھی فرض قرار دیا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ حج کا بھی ہے کہ آپؐ نے حج کی فرضیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس کو اس طریقے کے مطابق ادا کرنا بھی لازم قرار دیا ہے جس طریقے پر آپؐ نے اسے ادا کیا ہے۔ مثلاً آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ((خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ))' یعنی مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو۔ لیکن بہت سے فرائض ایسے ہیں جن کی ادائیگی کو تو لازم قرار دیا گیا ہے لیکن ان کو اس طریقے پر ادا کرنا جیسے کہ آپؐ نے ادا کیا ہے' شریعت اسلامیہ میں لازم نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً مسلمانوں پر فرمانِ الٰہی ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ کے ذریعے قصاص کو لازم کیا گیا۔ آپؐ کے زمانے میں قصاصاً قتل کرنے کے لیے تلوار سے گردن اڑائی جاتی تھی۔ اب اس کی جگہ پھانسی کے طریقے نے لے لی ہے۔ اب کون سا عالم دین ایسا ہے جو یہ فتویٰ جاری کرے گا کہ بذریعہ پھانسی قصاص لینے سے قصاص کا فریضہ ادا نہیں ہوتا اور اگر کوئی اسلامی ریاست قصاص کے حکم کی ادائیگی کے لیے پھانسی کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو اس کی اُخروی نجات ممکن نہیں ہے؟ حق بات یہ ہے کہ جس فرض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اس کے طریقے کو بھی لازم قرار دیا گیا ہو اُس فرض کو اس طریقے کے مطابق ادا کرنا لازم ہے' لیکن جن فرائض میں صرف فرض کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے' کوئی طریقہ لازم نہیں کیا گیا ان فرائض کی ادائیگی کے لیے سیرت النبیؐ سے رہنمائی لیتے ہوئے کوئی بھی ایسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے اس فرض کی ادائیگی بہتر طریقے سے ہو سکے' بشرطیکہ وہ طریقہ کسی شرعی نص کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ظلم کے خاتمے اور عدل کے قیام کے لیے قتال کو اُمت مسلمہ پر فرض قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے زمانے کے حالات وواقعات اور اسباب ووسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے کبھی صلح کی اور کبھی جنگ' آپؐ نے تلواروں سے جنگ لڑی اور گھوڑوں' اونٹوں وغیرہ پر سفر کیا' اپنے دفاع کے لیے کبھی خندق کھودی تو کبھی آگے بڑھ کر اقدام کیا' آپؐ نے ہجرت بھی کی اور اللہ کے دشمنوں کو قتل بھی کیا اور معاف بھی کیا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے بھی کسی مسلمان معاشرے مثلاً پاکستان میں ظلم کے خاتمے' اللہ کے دین کی سربلندی اور نظامِ عدل کے قیام کے لیے بعینہٖ اسی منہج کو اختیار کرنا ہے جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے دَور میں اختیار کیا تھا تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں لازماً ہجرت بھی کرنی ہو گی ☆ اور پاکستانی افواج سے قتال بھی' غزوۂ بدر کی طرح حکومت کے سرکاری خزانوں کو لوٹنے کے لیے اقدام بھی

☆ مثلاً پاکستان سے افغانستان کی طرف' بلکہ انڈیا شاید اس ہجرت کے لیے زیادہ مناسب ہو' کیونکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد افغانستان کی نسبت زیادہ ہے اور آپ ﷺ نے ہجرت اس علاقے کی طرف کی تھی جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔

کرنا ہوگا اور غزوۂ اُحد کی طرح پاکستانی افواج سے لڑائی بھی، ہمیں اپنے دفاع کے لیے خندق بھی کھودنی ہوگی اور صلح حدیبیہ کی طرح اللہ کے دشمنوں یعنی حکومت پاکستان سے صلح بھی کرنی ہوگی۔ غزوۂ خیبر کی طرح اسرائیل پر بھی حملہ کرنا ہوگا اور فتح مکہ کی طرح دس ہزار کا لشکر لے کر حکومت پاکستان پر چڑھائی بھی۔ یہ وہ نتائج ہیں جو اس طرزِ فکر سے لازماً برآمد ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قول کے قائلین ان نتائج کو بقائمی ہوش وحواس قبول نہیں کریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت بحیثیت مجموعی ہمارے لیے ایک نمونہ ہے۔ یعنی ہم سیرت نبوی ﷺ کی جزئیات اور تفصیلات سے قطع نظر اس سے من جملہ رہنمائی لے سکتے ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ کی زندگی) میں بہترین اسوہ ہے''۔

اس آیت کے معنی ومفہوم پر ہم آگے چل کر تفصیلی بحث کریں گے۔ لہٰذا اقامت دین کے فرض کی ادائیگی کے لیے سیرت نبوی ﷺ سے ایک مجموعی رہنمائی لیتے ہوئے عصر حاضر میں کوئی منہج اختیار کرنا تو درست بھی ہوگا اور مطلوب بھی، لیکن اقامت دین کے فرض کی ادائیگی کے لیے سیرت کو بالتفصیل یا جزئی طور پر حجت قرار دینا سوائے غلو فی الدین اور شرعی نصوص کی خلاف ورزی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سینکڑوں روایات ایسی ہیں جن میں آپؐ نے مسلمانوں سے قتال کو حرام قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ پاکستانی افواج کافر ہیں لہٰذا ان سے قتال جائز ہے تو اب دو صورتیں ہیں۔ یا تو یہ فتویٰ لگانے والا مجتہد اور فقیہہ ہے یا پھر عامی ہے۔ پہلی صورت میں فتویٰ لگانے والا فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا یا تو مجتہد مخطی ہوگا یا مصیب، جبکہ دوسری صورت میں فتویٰ دینے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں ہے لہٰذا لازماً مخطی ہی ہوگا۔ جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ)) (۳۰)

''جس نے قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی، پس اگر وہ صحیح بھی ہو پھر بھی وہ خطا کار ہے''۔

امام ابن حجرؒ نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔(۳۱) امام ابن الصلاح نے اس کو 'دون الحسن' کہا ہے۔(۳۲) علامہ احمد شاکر نے اس کو 'صحیح' کہا ہے۔(۳۳) علامہ البانیؒ نے اس کو 'ضعیف' کہا ہے۔(۳۴)

شارحینِ حدیث نے وضاحت کی ہے کہ اس روایت سے مراد وہ افراد ہیں جو کہ قرآن کی تفسیر کی اہلیت نہیں رکھتے اور پھر بھی اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ تو گویا یہ حضرات قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ضروری علومِ اسلامیہ سے ناواقف ہو اور وہ قرآنی آیات کی تطبیق اسلامی معاشروں پر شروع کر دے اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو کافر، مشرک اور منافق بنا دے تو ایسا شخص بھی اس حدیث کا

مصداق ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس فعل کی اس قدر مذمت کی ہے کہ اگر اس کی رائے درست بھی ہو جائے تو پھر بھی وہ خطا کار ہے' یعنی آپؐ نے ایسے تمام مختصر راستے (short cuts) بند کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ علوم اسلامیہ کو سیکھے بغیر قرآن کی تفسیر وتعبیر کی طرف لے جانے والے ہوں۔

پس عامی اگر افواج پاکستان پر کفر کا فتویٰ لگائے تو وہ درحقیقت اپنے اوپر کفر کا فتویٰ لگا رہا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

((اِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِاَخِیْهِ یَا کَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِهٖ اَحَدُهُمَا)) (۳۵)

''جب کوئی آدمی اپنے کسی مسلمان بھائی کو کہے: اے کافر! تو ان دونوں میں سے ایک کافر ہو جاتا ہے''۔

اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان سے مقصود یہ ہے اگر تو جس کو اس نے کافر کہا وہ واقعتاً کافر ہوا تو یہ کہنے والا سچا ہے' اور اگر جس کو اس نے کافر کہا ہے وہ اللہ کے نزدیک کافر نہیں ہے تو کہنے والا شخص خود کافر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کفر کا فتویٰ لگانے میں بہت محتاط ہیں۔

جہاں تک اُخروی نجات کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں اہل سنت کا متفق علیہ عقیدہ یہی ہے کہ ہم کسی بھی مسلمان پر کسی فرض کی ادائیگی کے ترک یا حرام کے ارتکاب کی وجہ سے یہ فتویٰ نہیں جاری کریں گے کہ اس کی نجات نہیں ہوگی۔ اہل سنت کے نزدیک ایسا فتویٰ جاری کرنا شرک ہے۔ مثلاً ایک صحیح روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ بنی اسرائیل میں دو دوست تھے۔ ان میں ایک بڑا متقی اور پرہیز گار تھا جبکہ دوسرا عرصۂ دراز سے کسی گناہ کبیرہ میں مبتلا تھا۔ اس متقی کا جب بھی اپنے گناہ گار بھائی کے پاس سے گزر ہوتا تو وہ اس کو اس گناہ سے منع کرتا تھا۔ اسی طرح سالہا سال گزر گئے۔ ایک دن وہ گناہ گار آدمی اپنے متقی بھائی کی تبلیغ کے جواب میں کہنے لگا:

((..... خَلِّنِیْ وَرَبِّیْ اَبُعِثْتَ عَلَیَّ رَقِیْبًا؟ قَالَ وَاللّٰهِ لَا یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ [اَوْ لَا یُدْخِلُكَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ] فَقَبَضَ اَرْوَاحَهُمَا فَاجْتَمَعَا عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ' فَقَالَ لِهٰذَا الْمُجْتَهِدِ اَكُنْتَ بِیْ عَالِمًا اَوْ كُنْتَ عَلٰی مَا فِیْ یَدِیْ قَادِرًا؟ وَقَالَ لِلْمُذْنِبِ اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِیْ وَقَالَ لِلْآخَرِ اذْهَبُوْا بِهٖ اِلَی النَّارِ)) (۳۶)

''میرا معاملہ میرے ربّ پر چھوڑ دے۔ کیا تجھے میرے اوپر نگران بنایا گیا ہے؟ تو متقی آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا [یا یوں کہا کہ تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا]۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی ارواح قبض کیں اور وہ دونوں اپنے ربّ کے دربار میں جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے متقی آدمی سے کہا: کیا تو میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے یا جو میرے ہاتھ میں ہے (یعنی مغفرت اور جنت میں داخل کرنا) کیا تو اس پر قادر ہے؟ اللہ تعالیٰ نے گناہ گار سے کہا: تو

جنت میں داخل ہو جا اور متقی کے بارے میں فرشتوں کو حکم دیا: اس کو آگ کی طرف لے جاؤ''۔
علامہ البانیؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے(۳۷)۔ شیخ احمد شاکر نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔(۳۸)

اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال کی درجہ بندی

رسول اللہ ﷺ کا ہر قول ہمارے لیے شریعت ہے یا نہیں' اور اگر ہے تو اس میں کوئی درجہ بندی بھی ہے یا نہیں؟ اس بات کی وضاحت اس لیے از حد ضروری ہے کہ ناواقفیت کی بنا پر سنت رسول ﷺ کے معاملے میں دو ایسی انتہائیں وجود میں آ جاتی ہیں جو سنت کی حیثیت کو افراط و تفریط کا شکار کر کے اہل سنت کے منہج سے دور لے جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک انتہا وہ ہے جسے منکرین سنت نے اختیار کیا کہ سنت کی آئینی حیثیت کا انکار کر دیا جائے یا اسے چند مَن چاہی سنتوں تک محدود کر دیا جائے' اور دوسری انتہا یہ نظریہ ہے کہ اقوالِ رسول ﷺ میں پائی جانے والی تعلیمات میں تکلیفِ شرعی کے اعتبار سے درجہ بندی کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ تو فقہاء کی پیدا کردہ تقسیم ہے جس سے سنت کا استخفاف ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اس بحث کو سمجھنے کے لیے حدیث کی کتب سے چند اصول پیش کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ وضاحت کے لیے براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت کے حوالے پیش کیے جائیں تاکہ کسی کو یہ اعتراض نہ ہو کہ فقہ تو بہت بعد کی پیداوار ہے جس میں (معاذ اللہ) سنت کی درجہ بندی کر کے استخفافِ سنت جیسے فتنوں کا راستہ پیدا کر دیا گیا ہے۔

(۱) اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال سے بعض اوقات کسی فعل کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ نَظْرَةِ الْفَجْأَةِ فَقَالَ :((اِصْرِفْ بَصَرَكَ)) (۳۹)

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اچانک (کسی اجنبی عورت پر) نظر پڑ جانے کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے جواب دیا: ''اپنی نظر پھیر لو''۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔(۴۰) علامہ البانیؒ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔(۴۱)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے کسی اجنبی عورت پر اچانک نظر پڑ جانے کی صورت میں اس سے اپنی نظریں پھیرنے کا جو حکم دیا ہے یہ حکم فقہاء کے نزدیک وجوب کا فائدہ دے رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے اس حکم کا انکار کر دے تو اس شخص کا کسی اسلامی معاشرے میں حکم (status) کیا ہے؟ کیا ایسا شخص کافر ہے؟

جمہور علماءِ مالکیہ' شوافع' حنابلہ' اہل الظاہر اور اہل الحدیث کے نزدیک اگر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے کوئی ایسا حکم ثابت ہو جس کے کرنے کو لازم ٹھہرایا گیا ہو تو اسے فرض یا واجب کہتے ہیں۔ لہٰذا فرض یا واجب وہ ہے جس کے کرنے کو شارع نے مکلّف پر لازم ٹھہرایا ہو اور اس کو نہ کرنا باعث ملامت

بھی ہو اور اس کا تارک آخرت میں سزا کا بھی مستحق ہو۔ جمہور علماء کے نزدیک فرض اور واجب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ چاہے کسی حکم کا لزوم قرآن سے ثابت ہو یا سنت سے' دونوں ہی فرض ہیں' جبکہ احناف کے نزدیک فرض وہ ہے جو کہ قطعی ذریعہ مثلاً قرآن' متواتر حدیث یا اجماعِ اُمت سے ثابت ہو اور اس کے کرنے کو شارع علیہ السلام نے لازم ٹھہرایا ہو' جبکہ واجب وہ ہے جو کہ ظنی ذریعہ یعنی خبر واحد سے ثابت ہو اور اس کے کرنے کو شارع نے لازم ٹھہرایا ہو۔ لیکن تمام ائمہ اہل سنت مالکیہ' احناف' شوافع' حنابلہ اور اہل الحدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی فعل کی فرضیت یا وجوبیت اللہ کے رسول ﷺ کی سنت (یعنی خبر واحد) سے ثابت ہو رہی ہو اور کوئی شخص اس فرض یا واجب کو ماننے سے انکار کر دے تو اس کے منکر کو دنیا میں ملامت کی جائے گی اور وہ آخرت میں سزا کا بھی مستحق ہو گا' لیکن اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ الشیخ عاصم الحداد لکھتے ہیں:

''اعتقادی مسائل میں دوسرے تمام ائمہ حنفیہ متفق ہیں کہ فرض یا واجب کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کے منکر کی تکفیر کی جاتی ہے اور اس سے مراد وہ فرض یا واجب ہے جس کا علم قرآن یا تواتر کے ذریعے ہوا ہو اور دوسرا وہ جس کے منکر کی تکفیر نہیں کی جاتی اور اس سے مراد وہ فرض یا واجب ہے جس کا علم اخبار آحاد کے ذریعہ ہوا ہو''۔ (۴۲)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ایسی سنت کے منکر پر دنیا میں کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا لیکن اس کو سخت ملامت کی جائے گی اور آخرت میں بھی سزا کا مستحق ہو گا۔ اسی طرح ایسی سنت کے تارک کو بھی دنیا میں ملامت اور آخرت میں سزا ہو گی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ خبر واحد سے ثابت ہونے والے کسی حکم کی فرضیت یا وجوبیت پر اگر علمائے اُمت کا اجماع ہو تو پھر اس سنت کے منکر کی اجماع کی خلاف ورزی کی وجہ سے تکفیر کی جائے گی۔

(۲) بعض اوقات اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال سے استحباب ثابت ہوتا ہے۔ مستحب سے مراد یہ ہے کہ شارع نے کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کیا ہو لیکن اس کو مکلّف پر لازم قرار نہ دیا ہو۔ بعض اوقات مستحب میں تاکید زیادہ ہوتی ہے اور بعض اوقات کم۔ اسی لیے فقہاء نے اس کی دو قسمیں کی ہیں' یعنی مؤکدہ اور غیر مؤکدہ۔ آپ ﷺ کے اقوال سے بعض اوقات سنت مؤکدہ ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کا ارشاد ہے:

((اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَرْکَعْ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ اَنْ یَجْلِسَ)) (۴۳)

''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لے''۔

یہ ذہن میں رہے کہ جمہور فقہاء اور محققین اصولیین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن و سنت میں جہاں بھی امر کا صیغہ آئے گا اس سے مراد فرضیت یا وجوب ہو گا' لیکن اگر کچھ منصوص یا غیر منصوص قرائن ایسے ہوں جن سے معلوم ہو کہ یہ حکم یہاں لزوم کے لیے نہیں ہے تو پھر اس سے مراد استحباب لیا جائے گا۔ بعض دوسری صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم یہاں وجوب کے لیے نہیں ہے۔ ان روایات کو امام عبدالرحمٰن

مبارکپوریؒ نے سنن الترمذی کی شرح 'تحفۃ الاحوذی' میں بیان کیا ہے۔ امام ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

واتفق أئمة الفتوى أن الأمر في ذلك للندب(۴۴)

''اہل فتویٰ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث میں امر کا صیغہ استحباب کے لیے ہے''۔

لہٰذا تحیۃ المسجد کی دو رکعات سنت مؤکدہ ہے۔ جہاں تک اس بات کا معاملہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اگر آپ ﷺ کا قول وجوب کے لیے نہیں ہے تو پھر سنت مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟ اس کا تعین بھی قرائن سے ہوگا اور یہ قرائن منصوص بھی ہو سکتے ہیں' مثلاً دوسری احادیث مبارکہ' اور غیر منصوص بھی' مثلاً صحابہؓ کا عمل وغیرہ۔ امام عبدالرحمٰن مبارکپوری نے 'تحفۃ الاحوذی' میں اس موضوع سے متعلق کافی روایات کو اکٹھا کیا ہے جن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تحیۃ المسجد کی دو رکعات سنت مؤکدہ ہیں نہ کہ غیر مؤکدہ۔ طوالت کے خوف سے ہم ان روایات کو یہاں بیان نہیں کر رہے۔

جہاں تک سنت مؤکدہ کے حکم کا تعلق ہے تو ہم پہلے بھی اسے بیان کر چکے ہیں کہ سنت مؤکدہ کے منکر کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اس پر عمل کرنے والے کو ثواب ہوگا اور اس کے تارک کو دنیا میں ملامت کی جائے گی' لیکن آخرت میں عذاب نہیں ہوگا۔ سنن مؤکدہ کے حکم کے بارے میں دو ابحاث بڑی اہم ہیں:

ا: اگر کوئی شخص کسی سنت مؤکدہ کو مستقل طور پر ترک کر دے تو یہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً کوئی ساری زندگی صرف فرض نماز پڑھتا رہے اور سنن مؤکدہ ادا نہ کرے تو شرعاً گناہ گار ہوگا۔

ب: اگر کوئی معاشرہ' جماعت یا گروہ کسی سنت مؤکدہ کو کلی طور پر ترک کر دے تو یہ جائز نہیں ہے۔ امام شاطبیؒ نے اس بارے میں 'الموافقات' میں بڑی عمدہ بحث کی ہے کہ ایک سنت مؤکدہ فرد کے اعتبار سے تو سنت ہوتی ہے لیکن اجتماع یا معاشرے کے اعتبار سے فرض کفایہ ہوتی ہے۔ مثلاً نکاح کرنا جمہور علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ اگر کوئی شخص ذاتی طور پر نکاح کی ضرورت محسوس نہ کرے یا کسی اور وجہ سے نکاح نہ کرے تو دنیا میں تو اسے بغیر کسی شرعی عذر کے نکاح نہ کرنے پر ملامت کی جائے گی لیکن آخرت میں وہ عذاب کا مستحق نہ ہوگا' لیکن کسی مسلمان معاشرے کے لیے یہ بالکل بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اجتماعی طور پر نکاح کی سنت کو ترک کر دے۔ ایسی صورت میں سارا معاشرہ گناہ گار ہوگا اور آخرت میں عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے قول سے کسی فعل کے مستحب ہونے کا علم ہوتا ہے اور یہ فعل سنتِ غیر مؤکدہ ہوتا ہے نہ کہ سنت مؤکدہ۔ مثلاً آپ ﷺ کے ایک فرمان کے الفاظ ہیں:

((اِنَّ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی لَا یَصْبُغُوْنَ فَخَالِفُوْھُمْ)) (۴۵)

''یہود اور عیسائی خضاب نہیں کرتے۔ پس تم ان کی مخالفت کرو (یعنی خضاب کرو)''۔

یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے قرینے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس حدیث میں یہ حکم وجوب کے لیے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حکم استحباب کے لیے ہے' جیسا کہ صحابہؓ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے' کیونکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ خضاب کرتے تھے جبکہ حضرت علیؓ' حضرت انسؓ' حضرت اُبی بن کعب اور حضرت سلمہ بن اکوعؓ وغیرہ خضاب نہیں کرتے تھے۔(۴۶) وہ روایات جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے ان کا اسلوبِ بیان بھی ایسا ہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرو یا مشرکین کی مخالفت کرو اور داڑھی بڑھاؤ۔ ان راویات میں داڑھی رکھنے کا حکم وجوب کے لیے ہے کیونکہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل اس بات پر قرینہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے۔

ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ المزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوْا قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ)) قَالَ فِي الثَّالِثَةِ : ((لِمَنْ شَاءَ)) كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً (۴۷)

''مغرب کی فرض نماز سے پہلے نماز (دو رکعت نفل) پڑھو''۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ کہی اور تیسری مرتبہ یہ اضافہ کیا کہ ''جو چاہے پڑھ لے''۔ اور آپؐ نے تیسری مرتبہ 'جو چاہے' کے الفاظ اس لیے کہے کہ لوگ اس کو سنت (مؤکدہ) نہ سمجھ لیں''۔

اس حدیث میں 'لِمَنْ شَاءَ' کے الفاظ سے واضح ہو گیا کہ آپؐ کا حکم استحباب کے معنی میں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ صحابہؓ سنت کا لفظ سنت مؤکدہ (یعنی ایسی سنت جس کا چھوڑنا باعث ملامت ہو) کے لیے بھی استعمال کرتے تھے' اسی لیے صحابیؓ نے یہ وضاحت کی کہ آپؐ نے 'لِمَنْ شَاءَ' کے ذریعے واضح کیا کہ لوگ اس عمل کو سنت (مؤکدہ) نہ بنالیں۔ امام ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

(أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً) أي طريقة لازمة لا يجوز تركها أو سنة راتبة يكره تركها وليس المراد ما يقابل الوجوب(۴۸)

''اس جملے سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس کو کوئی ایسا لازمی طریقہ نہ سمجھ لیں کہ جس کا ترک کرنا جائز نہیں ہوتا یا اس کو سنت مؤکدہ نہ بنالیں کہ جس کو چھوڑنا مکروہ ہے۔ یہاں اس حدیث میں سنت سے مراد وہ نہیں ہے جو واجب کے بالمقابل ہو''۔

(۳) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کا قول مبارک کسی فعل کی اباحت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً:

((حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ)) (۴۹)

''بنی اسرائیل سے بیان کرو (یعنی اسرائیلی روایات) اور اس میں کوئی گناہ نہیں ہے''۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن مجید میں بنی اسرائیل سے متعلقہ مجمل واقعات کی تفصیل کے لیے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس حدیث میں 'حَدِّثُوْا' امر کا صیغہ نہ ہی وجوب

کے لیے ہے اور نہ ہی استحباب کے لیے' بلکہ یہ اباحت کے لیے ہے' یعنی بنی اسرائیل سے روایت کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ روایت احکامِ شرعیہ سے متعلق نہ ہو اور دوسرے یہ کہ وہ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی عقائد یا تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔ امام ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

حدثوا صيغة أمر تقتضى الوجوب فأشار إلى عدم الوجوب و أن الأمر فيه للإباحة بقوله و لا حرج(۵۰)

''حَدِّثُوْا صیغہ امر ہے جو وجوب کا متقاضی ہے' لیکن آپؐ نے اس فعل کے عدم وجوب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا یہاں امر اباحت کے معنی میں ہے' جیسا کہ 'وَلَا حَرَجَ' کے الفاظ اس کی اباحت کی دلیل ہیں''۔

مباح کی تعریف اور حکم کے بارے میں الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

المباح: هو ما خير الشارع المكلف بين فعله و تركه' و لا مدح و لا ذم على الفعل و الترك..... وان حكم المباح أنه لا ثواب فيه و لا عقاب' و لكن قد يثاب عليه بالنية والقصد كمن يمارس أنواع الرياضية البدنية بنية تقوية جسمه' ليقوى على محاربة الأعداء(۵۱)

''مباح سے مراد یہ ہے کہ شارع نے مکلّف کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اختیار دیا ہو..... مباح کا حکم یہ ہے کہ اس میں نہ ثواب ہے اور نہ گناہ' لیکن اگر اچھی نیت اور ارادے سے کوئی مباح کام کرے گا تو اس کا ثواب ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص اس لیے ورزش کرتا ہے تاکہ اس کا جسم مضبوط ہو اور وہ دینِ اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرے تو اس ورزش کا بھی ثواب ہوگا''۔

فرض' واجب اور مستحب کی طرح مباح کے قواعد وضوابط کے بارے میں بھی اصولیین نے اصول کی کتابوں میں تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ کسی فعل کے مباح ہونے کے کیا قرائن اور دلائل ہوتے ہیں۔ اس بارے میں الدکتور عبدالکریم زیدان نے 'الوجیز' میں عمدہ بحث کی ہے۔ امام شاطبیؒ بھی 'الموافقات' میں مباح کے حوالے سے بڑی نفیس ابحاث لے کر آئے ہیں۔ مثلاً امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک مباح فعل فرض یا مستحب بھی بن جاتا ہے اور بعض اوقات مکروہ یا حرام بھی۔ مثلاً قرآن میں ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ کا حکم ہے جو کہ اباحت کے لیے ہے' یعنی جو چاہے کھانا کھائے اور جو چاہے نہ کھائے' لیکن اگر کوئی شخص مستقل کھانا چھوڑ دے اور موت کے قریب پہنچ جائے' جیسا کہ بھوک ہڑتال میں ہوتا ہے' تو اب اس کے لیے یہی حکم (یعنی کھانا کھانے کا) فرضیت کے درجے میں ہوگا۔ اسی طرح اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرنا ایک مباح فعل ہے' لیکن اس مباح فعل پر مداومت اس فعل کو حرمت کے درجے تک پہنچا دے گی۔

قرآن وسنت میں امر کا صیغہ ہر وقت وجوب کے معنی میں نہیں ہوتا' جیسا کہ ناواقف لوگوں کا خیال ہے۔امام سبکیؒ نے 'جمع الجوامع' میں امر کے صیغے کے ۲۶ معانی کا تذکرہ کیا ہے۔بعض اصولیین نے امر کے صیغے کے سترہ اور بعض نے سولہ معانی بھی بیان کیے ہیں۔مثلاً وجوب' ندب' اباحت' تہدید' ارشاد' تأدیب' انذار' امتنان' اکرام' امتہان' تکوین' تعجیز' اہانت' تسویہ' دعا' تمنی' احتقار' خبر' اعتبار' تعجب' تکذیب' مشورہ' ارادہ' امتثال' اذن' انعام اور تفویض وغیرہ۔اصولیین نے امر کے یہ تمام معانی قرآن وسنت کی نصوص سے ثابت کیے ہیں۔طوالت کے خوف سے ہم ان تمام نصوص کو بیان نہیں کر رہے۔مثال کے طور پر ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں امر کا صیغہ دعا کے معنی میں ہے' ﴿ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ﴾ (الدُّخان) میں اہانت کے لیے ہے اور ﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ٤٠) میں تہدید کے لیے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وہ سنن جو کسی فعل کی اباحت سے متعلق ہیں' ان سنن پر عمل یا ان کی ترغیب وتشویق دین اسلام کا مطلوب ومقصود نہیں ہے' سوائے اس کے کہ وہ مباح استحباب یا وجوب کے درجے کو پہنچ جائے' جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(٤) بعض اوقات آپ ﷺ کے قول سے کسی فعل کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کا فرمان ہے:

((لَا يَمْشِ اَحَدُكُمْ فِيْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ)) (٥٢)

''تم میں سے کوئی شخص ایک جوتے میں نہ چلے''۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے ایک جوتا پہن کر چلنے سے منع فرمایا' لیکن ایک جوتا پہن کر چلنا حرام نہیں ہے' بلکہ مکروہ ہے۔لہٰذا اس حدیث میں نہی کا صیغہ کراہت کے لیے ہے۔امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

يكره المشي في نعل واحدة أو خف واحد(٥٣)

''ایک جوتے یا ایک موزے میں چلنا مکروہ ہے''۔

امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث کو بیان کرنے کے لیے 'ما جاء في كراهية المشي في النعل الواحدة' کے الفاظ سے باب باندھ کر اس فعل کی کراہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعُدُوِّ وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ)) (٥٤)

''دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو''۔

اس حدیث میں دشمن سے ملاقات کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ تمنا کرنا مکروہ ہے۔جیسا کہ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب 'كراهية تمني لقاء العدو' میں اس کی کراہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔اسی

طرح امام نوویؒ نے 'صحیح مسلم' میں 'کراھیة تمنی لقاء العدو' اور امام ابوداؤد نے سنن ابی داؤد میں 'فی کراھیة تمنی لقاء العدو' کے عنوان سے باب باندھ کر اس فعل کی کراہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اصولیین کی تعریف کے مطابق مکروہ سے مراد وہ فعل ہے جس کے نہ کرنے کا شارع نے حکم دیا ہو لیکن اس کے نہ کرنے کو لازم نہ ٹھہرایا ہو۔ مکروہ کو ترک کرنا اولیٰ ہے۔ الدکتور عبدالکریم زیدان مکروہ کے حکم کے بارے میں لکھتے ہیں:

و حکم المکروہ أن فاعلہ لا یأثم و إن کان ملوما و أن تارکہ یمدح و یثاب اذا کان ترکہ للّٰہ (۵۵)

''مکروہ کا حکم یہ ہے کہ اس کا کرنے والا گناہ گار نہ ہوگا اگرچہ اس کو ملامت کی جائے گی اور اس کا تارک قابل مدح اور ثواب کا مستحق ہے جبکہ اس نے اس فعل کو اللہ کے لیے ترک کیا ہو''۔

احناف اس مکروہ کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں جبکہ جمہور علماء صرف مکروہ کہتے ہیں۔ تمام ائمۂ اہل سنت کے نزدیک اس کے منکر کی تکفیر نہیں ہوگی۔ عامۃ الناس کو مکروہات سے بچنے کی ترغیب وتشویق بھی دلائی جائے گی۔

(۵) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے قول سے کسی فعل کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا یَبِعْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ وَلَا یَخْطُبْ بَعْضُکُمْ عَلٰی خِطْبَةِ بَعْضٍ)) (۵۶)

''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے اور نہ ہی کوئی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے''۔

اگر کسی شخص نے بذریعہ ایجاب وقبول کوئی سودا مکمل کرلیا ہے تو اس کے اس سودے پر سودا کرنا حرام ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا کسی خاندان میں رشتہ طے ہو چکا ہو تو وہاں اپنے رشتے کی بات چلانا حرام ہے سوائے اس کے کہ پہلا شخص دوسرے کو اجازت دے دے یا وہ اس جگہ نکاح کا ارادہ ترک کردے۔

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ھذہ الأحادیث ظاھرة فی تحریم الخطبة علی خطبة أخیہ و أجمعوا علی تحریمھا اذکان قد صرح للخاطب بالإجابة و لم یأذن و لم یترک (۵۷)

''ان احادیث مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی منگنی پر منگنی کرنا حرام ہے اور اُمت کا اس فعل کی حرمت پر اجماع ہے جبکہ لڑکی والوں نے پیغام بھیجنے والے کے پیغام کو صراحتاً قبول کرلیا ہو اور پہلے شخص نے دوسرے کو نہ تو وہاں پیغام بھیجنے کی اجازت دی ہو اور نہ ہی اس جگہ نکاح کا ارادہ ترک کیا ہو''۔

احناف ایسے فعل کو حرام کی بجائے مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔ جمہور اور احناف کے نزدیک اس کی تعریف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ حرام یا مکروہ تحریمی سے مراد ایسا فعل ہے جس کے نہ کرنے کا شارع نے حکم دیا ہو اور اس کے نہ کرنے کو لازم بھی ٹھہرایا ہو۔ اس کے مرتکب کو ملامت کی جائے گی اور اس کو آخرت میں عذاب بھی ہوگا۔ احناف کے نزدیک اگر اس کا علم قطعی ذریعے یعنی قرآن' خبر متواتر یا اجماع سے ہوگا تو یہ حرام ہے اور اگر اس کا علم ظنی ذریعے یعنی خبر واحد سے ہوگا تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔ جبکہ جمہور اسے حرام ہی کہتے ہیں چاہے قرآن سے اس کا علم حاصل ہو یا خبر واحد سے۔ ائمہ جمہور اور احناف کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کسی فعل کی حرمت بذریعہ سنت (یعنی خبر واحد) معلوم ہو اور اس سنت کا کوئی شخص انکار کر دے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی اگرچہ دنیا میں اس کو سخت ملامت کی جائے گی اور آخرت میں وہ عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا۔ الشیخ عاصم الحداد لکھتے ہیں:

''اور سب' وہ (یعنی احناف) اور دوسرے (یعنی مالکیہ' شافعیہ' حنابلہ و اہل الحدیث) یہ کہتے ہیں کہ تکفیر اس شخص کی کی جائے گی جو کسی قطعی دلیل سے ثابت چیز کا انکار کرے اور اس شخص کی تکفیر نہیں کی جائے جو کسی ظنی دلیل سے ثابت چیز کا انکار کرے۔ اسے صرف فاسق یا گمراہ قرار دیا جا سکتا ہے''۔ (۵۸)

(۶) بعض اوقات کسی مسئلے میں نبی اکرم ﷺ کا ایک قول ہوتا ہے اور ایک شخص اس قول پر عمل کرنے کو سنت پر عمل سمجھ رہا ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کی ترغیب و تشویق دلا رہا ہوتا ہے جبکہ آپ ﷺ کا وہ قول آپؐ ہی کے کسی دوسرے قول یا فعل سے منسوخ ہوتا ہے۔ عام اشخاص یا اہل علم کی بات تو کجا بعض اوقات بعض صحابہؓ کو بھی آپؐ کی کسی سنت کے نسخ کا علم نہیں ہوتا تھا اور وہ منسوخ سنت پر خود بھی عمل کر رہے ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب و تشویق دلا رہے ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صحابیؓ ہر وقت آپؐ کی مجلس میں موجود نہیں ہوتا تھا اس لیے ہر صحابیؓ کو ہر حدیث کا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((تَوَضَّئُوْا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ)) (۵۹)

''جس کو آگ نے چھوا ہو اُس کے کھانے کے بعد وضو کرو''۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْوُضُوْءُ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ وَلَوْ مِنْ ثَوْرِ أَقِطٍ)) قَالَ فَقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ أَنَتَوَضَّأُ مِنَ الدُّهْنِ؟ أَنَتَوَضَّأُ مِنَ الْحَمِيْمِ؟ قَالَ فَقَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ يَا ابْنَ أَخِيْ إِذَا سَمِعْتَ حَدِيْثًا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَلَا تَضْرِبْ لَهُ مَثَلًا (۶۰)

''جس چیز کو آگ نے چھوا ہو اُس کے کھانے کے بعد وضو کرو چاہے وہ پنیر کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ

ہو''۔راوی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا: کیا ہم چکناہٹ کی وجہ سے وضو کریں؟ کیا ہم گرم پانی کی وجہ سے بھی وضو کریں؟ (کیونکہ گرم پانی کو بھی آگ چھوتی ہے)۔راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب میں کہا: اے میرے بھتیجے! جب تمہارے سامنے اللہ کے رسول ﷺ کی کوئی حدیث بیان کی جائے تو اس کے لیے مثالیں نہ بیان کیا کرو''۔

علامہ البانیؒ نے اس روایت کو 'حسن' کہا ہے۔(۶۱) شیخ احمد شاکر نے اس کی سند کو 'صحیح' کہا ہے۔(۶۲)

اصل مسئلہ یہ ہے کہ شروع میں اللہ کے رسول ﷺ نے آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضو کا حکم دیا تھا۔ بعد میں آپؐ نے ہی اس کو منسوخ کر دیا اور اس نسخ کا علم بعض صحابہؓ کو نہ ہوا' لہٰذا وہ اس منسوخ سنت پر خود بھی عمل کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم جاری کرتے رہے۔حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے:

كَانَ آخِرُ الْاَمْرَيْنِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ(۶۳)

''دونوں باتوں میں سے آخری بات جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے وہ ایسی چیزوں کے کھانے کے بعد وضو نہ کرنا ہے جنہیں آگ نے چھوا ہو''

امام نوویؒ نے اس حدیث کی سند کو 'صحیح' کہا ہے۔(۶۴) امام ابن حجرؒ نے اس کو 'حسن' کہا ہے۔(۶۵) امام ابن الملقنؒ نے اس روایت کو 'صحیح' کہا ہے۔(۶۶) امام طحاویؒ نے بھی 'صحیح' کہا ہے۔(۶۷) امام ابن حزمؒ نے اس کو 'قابل حجت' قرار دیا ہے۔(۶۸) ابن قدامہؒ نے اس روایت کو 'ضعیف' کہا ہے۔(۶۹)

یہ روایت صحیح ہے اور جمہور صحابہؓ' تابعینؒ اور ائمہ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے استعمال کے بعد وضو کرنا واجب نہیں ہے۔صحابہؓ میں حضرت ابو بکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ' حضرت ابوامامہؓ' حضرت عامر بن ربیعہؓ' حضرت مغیرہ بن شعبہؓ' حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ میں حضرت عبیداللہ السلمانیؒ' حضرت سالم بن عبداللہؒ' حضرت قاسم بن محمدؒ اور فقہائے اہل مدینہ اور ائمہ میں امام مالکؒ' امام شافعیؒ' امام احمد بن حنبلؒ' امام ابوحنیفہؒ' امام اسحاق بن راھویہؒ' امام عبداللہ بن مبارکؒ' امام سفیان ثوریؒ' اہل کوفہ اور اہل حجاز کا موقف یہی ہے۔جبکہ صحابہؓ اور تابعین کی ایک جماعت آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کے وجوب کی قائل ہے۔تفصیل کے لیے امام نووی کی 'شرح مسلم' اور امام عبدالرحمٰن مبارکپوری کی 'تحفۃ الاحوذی' کا مطالعہ مفید رہے گا۔اس بحث سے مقصود یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ایک حدیث پڑھ کر اس پر عمل یا اس کی ترغیب وتشویق شروع نہیں کر دینی چاہیے' بلکہ علماء سے پوچھ پوچھ کر عمل کرنا چاہیے۔

(۷) بعض اوقات نبی کریم ﷺ کا کوئی حکم تدبیری امور سے متعلق ہوتا ہے۔آپؐ کے ایسے اقوال

بھی سنت نہیں ہیں۔ حضرت رافع بن خدیج ؓ سے مروی ہے:

قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يَأْبُرُوْنَ النَّخْلَ يَقُوْلُوْنَ يُلَقِّحُوْنَ النَّخْلَ فَقَالَ: ((مَا تَصْنَعُوْنَ؟)) قَالُوْا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ: ((لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْرًا)) فَتَرَكُوْهُ فَنَفَضَتْ [أَوْ فَنَقَصَتْ] قَالَ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ: ((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ؟)) (۷۰)

''اللہ کے نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کھجور کی پیوندکاری کرتے تھے اور وہ کہتے تھے اس طرح فصل زیادہ ہوتی ہے۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا: ''تم یہ کیا کرتے ہو؟'' انہوں نے کہا: ہم عرصہ دراز سے ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''شاید کہ تم ایسا نہ کرو تو بہتر ہو''۔ چنانچہ صحابہؓ نے اگلی فصل میں ایسا نہ کیا جس سے پھل کم ہو گیا۔ صحابہؓ نے آپؐ سے اس بات کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''سوائے اس کے نہیں کہ میں تو ایک انسان ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین سے متعلق کوئی حکم دوں تو تم اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور جب میں تمہیں اپنی ذاتی رائے سے کوئی حکم جاری کروں تو میں بھی ایک انسان ہوں''۔

یہ حدیث اس مسئلے میں نص صریح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعض احکامات تشریع کے لیے نہ تھے۔ جیسے کسی مسئلے میں آپؐ نے بعض صحابہؓ کو دنیاوی امور میں کوئی مشورہ دے دیا ہو یا ان کی رہنمائی کر دی ہو۔

(۸) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے احکامات سفارش کی قبیل سے ہوتے ہیں۔ یہ بھی اُمت کے لیے شریعت نہیں ہیں۔ مثلاً روایات میں آتا ہے کہ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھیں جو ایک غلام حضرت مغیثؓ کے نکاح میں تھیں۔ بعد ازاں ایک موقع پر حضرت عائشہؓ نے حضرت بریرہؓ کو آزاد کر دیا۔ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورت آزاد ہو جائے تو اسے یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ اپنی غلامی کی حالت میں کیے ہوئے نکاح کو برقرار رکھے یا توڑ دے۔ حضرت بریرہؓ نے اپنی آزادی کے بعد اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے حضرت مغیثؓ کے نکاح میں رہنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت مغیثؓ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ بریرہؓ کو سمجھائیں۔ تو آپؐ نے حضرت بریرہؓ کو بلوا کر کہا:

((يَا بَرِيْرَةُ اتَّقِي اللّٰهَ فَإِنَّهُ زَوْجُكِ وَأَبُوْ وَلَدِكِ)) فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَتَأْمُرُنِي بِذٰلِكَ؟ قَالَ: ((لَا، إِنَّمَا أَنَا شَافِعٌ)) فَكَانَ دُمُوْعُهُ تَسِيْلُ عَلٰى خَدِّهِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِلْعَبَّاسِ: ((أَلَا تَعْجَبُ مِنْ حُبِّ مُغِيْثٍ بَرِيْرَةَ وَبُغْضِهَا إِيَّاهُ؟)) (۷۱)

''اے بریرہؓ! اللہ سے ڈر، وہ تیرا شوہر ہے اور تیرے بچے کا باپ ہے۔ تو حضرت بریرہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپؐ مجھے مغیثؓ کی طرف لوٹ جانے کا حکم دے رہے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، میری حیثیت تو ایک سفارشی کی ہے''۔ حضرت مغیثؓ کی حالت یہ تھی کہ (وہ مدینہ کی

گلیوں میں حضرت بریرہؓ کے پیچھے پھرتے تھے اور)ان کے گالوں پر ہر وقت آنسو بہتے رہتے تھے۔تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا: ''کیا تجھے تعجب نہیں ہوتا کہ مغیثؓ کو بریرہؓ سے کتنی محبت ہے اور بریرہؓ کو مغیثؓ سے کس قدر نفرت ہے؟''

امام ابن حزمؒ نے اس روایت کو 'قابل حجت' قرار دیا ہے۔(۷۲) امام ابن تیمیہؒ نے اس کو 'صحیح' کہا ہے۔(۷۳) علامہ البانیؒ نے اس کو 'صحیح' کہا ہے۔(۷۴) شیخ احمد شاکر نے بھی اس کی سند کو 'صحیح' کہا ہے۔(۷۵)

اس حدیث سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا ہر حکم ماننا واجب ہے۔کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت بریرہؓ آپؐ سے یہ سوال نہ کرتیں کہ کیا آپؐ مجھے حکم دے رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں یہ استدلال درست نہیں ہے' بلکہ یہ صریح نصوص کے خلاف ہے' جیسا کہ تأبیر نخل والی روایت میں ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے جب ایک دفعہ صحابہؓ کو راستوں میں بیٹھنے سے منع کیا تو صحابہؓ نے آپ کا یہ حکم نہ مانا' کیونکہ صحابہؓ کے نزدیک یہ کوئی شرعی حکم نہ تھا' بلکہ اس حدیث سے تو اس کے برعکس حکم معلوم ہوتا ہے' کیونکہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت بریرہؓ کو کہا کہ اللہ سے ڈرو تو حضرت بریرہؓ کو آپؐ سے سوال ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔حضرت بریرہؓ کا آپؐ کے الفاظ 'اِتَّقِی اللّٰہَ' کے باوجود آپؐ سے سوال کرنا کہ کیا آپؐ مجھے حکم دے رہے ہیں' یہ واضح کرتا ہے کہ آپؐ کا ہر حکم شرعی نہیں ہوتا۔لہٰذا آپؐ کے ایسے احکامات جو کہ مشورے کی قبیل سے ہوں' ان کا انکار' انکار سنت نہیں ہے۔علاوہ ازیں ایسی سنن کی اتباع بھی لازم نہیں ہے۔

(۹) بعض اوقات آپ ﷺ کے احکامات قضاء سے متعلق ہوتے ہیں۔آپؐ کے ایسے احکامات بھی سنت یعنی مصدر شریعت نہیں ہیں۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِہٖ مِنْ بَعْضٍ فَمَنْ قَضَیْتُ لَہٗ بِحَقِّ اَخِیْہِ شَیْئًا بِقَوْلِہٖ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَۃً مِنَ النَّارِ فَلَا یَاْخُذْھَا)) (۷۶)

''تم میں سے بعض لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہیں' اور شاید تم میں سے کوئی ایک زیادہ چرب زبان واقع ہو۔پس اگر میں کسی ایک شخص کو اس کی چرب زبانی کی وجہ سے اس کے بھائی کے حق میں سے دے دوں' تو ایسے شخص کو میں آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں' پس وہ اس کو نہ لے''۔

(۱۰) بعض اوقات آپ ﷺ کے احکامات کسی ایک شخص کے بارے میں خاص ہوتے ہیں' لہٰذا تمام اُمت کے لیے وہ سنت نہیں ہوتے۔مثلاً ایک روایت کے الفاظ ہیں:

ذَبَحَ اَبُوْ بُرْدَۃَ قَبْلَ الصَّلَاۃِ فَقَالَ لَہُ النَّبِیُّ ﷺ: ((اَبْدِلْھَا)) قَالَ لَیْسَ عِنْدِیْ اِلَّا جَذَعَۃٌ [قَالَ شُعْبَۃُ وَاَحْسِبُہٗ قَالَ: ھِیَ خَیْرٌ مِنْ مُسِنَّۃٍ] قَالَ: ((اِجْعَلْھَا مَکَانَھَا وَلَنْ تَجْزِیَ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَکَ)) (۷۷)

''حضرت ابو بردہؓ نے نماز عید سے پہلے قربانی کر لی تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم اس کے بدلے میں ایک اور قربانی کرو''۔ تو انہوں نے جواباً کہا: میرے پاس تو صرف ایک جذعہ (بکری) ہے۔ [حدیث کے راوی شعبہ کہتے ہیں کہ میرے خیال میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ (یعنی جذعہ) دوندے سے بہتر حالت میں ہے] تو آپؐ نے فرمایا: ''اس کے بدلے میں جذعہ (بکری) قربانی کے طور پر دے دو' لیکن یہ (یعنی جذعہ بکری) تیرے بعد کسی کو (بطور قربانی) کفایت نہیں کرے گی (یعنی بکری کے لیے دو دانتا ہونا ضروری ہے)''۔

اسی طرح آپ ﷺ کے بعض احکامات کے بارے میں صحابہؓ میں اختلاف بھی ہو جاتا تھا کہ وہ عام ہیں یا خاص۔ مثلاً آپؐ کے ایک صحابی حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ ان کے ساتھ ہی ان کے گھر میں رہتے تھے' لیکن یہ ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے۔ جب یہ بالغ ہو گئے تو حضرت ابو حذیفہؓ کو اُن کا اپنے گھر میں آنا جانا اور رہنا پسند نہ تھا' اس پر ان کی بیوی حضرت سہلہ بنت سہیلؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس مسئلے کا حل دریافت فرمایا تو آپؐ نے ان صحابیہؓ کو مشورہ دیا:

((أَرْضِعِيْهِ)) قَالَتْ وَكَيْفَ أُرْضِعُهُ وَهُوَ رَجُلٌ كَبِيْرٌ؟ فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَقَالَ: ((قَدْ عَلِمْتُ أَنَّهُ رَجُلٌ كَبِيْرٌ)) (۷۸)

''اس (یعنی سالمؓ) کو دودھ پلا دو'' تو حضرت سہلہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اسے کیسے دودھ پلاؤں جبکہ وہ ایک بالغ لڑکا ہے؟ تو اللہ کے رسول ﷺ مسکرائے اور فرمایا: ''میں جانتا ہوں کہ وہ ایک بالغ لڑکا ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس حدیث کے حکم کو صرف ان صحابیہؓ کے ساتھ خاص نہیں سمجھتی تھیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

فَبِذٰلِكَ كَانَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا تَأْمُرُ بَنَاتِ اَخَوَاتِهَا وَبَنَاتِ إِخْوَتِهَا أَنْ يُرْضِعْنَ مَنْ اَحَبَّتْ عَائِشَةُ اَنْ يَرَاهَا وَيَدْخُلَ عَلَيْهَا وَاِنْ كَانَ كَبِيْرًا خَمْسَ رَضَعَاتٍ ثُمَّ يَدْخُلُ عَلَيْهَا وَاَبَتْ أُمُّ سَلَمَةَ وَسَائِرُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنْ يُدْخِلْنَ عَلَيْهِنَّ بِتِلْكَ الرَّضَاعَةِ اَحَدًا مِنَ النَّاسِ حَتّٰى يَرْضَعَ فِي الْمَهْدِ وَقُلْنَ لِعَائِشَةَ وَاللّٰهِ مَا نَدْرِيْ لَعَلَّهَا كَانَتْ رُخْصَةً مِنَ النَّبِيِّ ﷺ لِسَالِمٍ دُوْنَ النَّاسِ (۷۹)

''اسی حدیث کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بھانجیوں اور بھتیجیوں کو حکم دیتی تھیں کہ وہ اس کو پانچ مرتبہ دودھ پلائیں جس کے بارے میں حضرت عائشہؓ کو یہ پسند ہوتا تھا کہ وہ ان کو دیکھے اور ان کے پاس آئے اگرچہ وہ بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اُم سلمہؓ اور باقی تمام ازواج مطہرات نے اس بات سے انکار کر دیا کہ کوئی شخص اس طرح (بڑی عمر میں) ان کا رضاعی رشتہ دار بنے اور پھر اس کے لیے ازواج

مطہرات کے پاس آنا جائز ہو۔ یہ تمام ازواج گود کی (حالت میں) رضاعت کی وجہ سے اپنے ساتھ رضاعی رشتہ داری کو جائز قرار دیتی تھیں۔ یہ ازواج حضرت عائشہؓ کو کہتی تھیں کہ اللہ کی قسم! ہم تو یہی سمجھتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ حکم صرف حضرت سالمؓ کے لیے تھا نہ کہ تمام لوگوں کے لیے''۔

علامہ البانیؒ نے اس روایت کو 'صحیح' کہا ہے۔(۸۰) امام ابوداؤد کے نزدیک بھی یہ روایت 'صالح' ہے۔

(۱۱) بعض اوقات آپ ﷺ کے احکامات 'سدًّا للذریعة' ہوتے ہیں۔ یعنی آپؐ کوئی حکم بطور شریعت جاری نہیں کرتے بلکہ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی کی طرف لے جانے والے کسی سبب اور ذریعے سے منع کرتے ہیں' حالانکہ وہ سبب اور ذریعہ بذاتہ شرعاً جائز ہوتا ہے۔ آپؐ کے ایسے احکامات کی اتباع بھی ضروری نہیں ہے۔ مثلاً ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا:

((إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوْسَ فِي الطُّرُقَاتِ)) قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَالَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا' نَتَحَدَّثُ فِيْهَا' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((فَإِذَا أَبَيْتُمْ إِلاَّ الْمَجْلِسَ فَأَعْطُوا الطَّرِيْقَ حَقَّهُ)) قَالُوْا وَمَا حَقُّهُ؟ قَالَ: ((غَضُّ الْبَصَرِ وَكَفُّ الْأَذٰى وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ)) (۸۱)

''راستوں میں بیٹھنے سے بچو''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہمارے لیے راستوں میں بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے' ہم یہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نے میری بات سے انکار کر دیا اور بیٹھنے کی بات کی ہے تو پھر راستے کو اس کا حق دو''۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ راستے کا حق کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''نظر کو جھکا کر رکھنا' کسی کو تکلیف دینے سے بچنا (تکلیف دہ چیز دور کرنا)' سلام کا جواب دینا' معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہؓ کو معلوم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ حکم کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ نے بھی صحابہؓ کے انکار پر ان پر کوئی دباؤ نہ ڈالا' بلکہ ان کو جس سبب سے یہ حکم جاری کیا تھا اس کی وضاحت کر دی' یعنی راستوں میں بیٹھو لیکن ان کا حق ادا کرو۔ گویا مطلق راستے میں بیٹھنے سے منع کرنا آپؐ کا مقصود نہ تھا' بلکہ آپؐ نے یہ حکم کسی سبب سے جاری کیا تھا اور وہ سبب یہ تھا کہ راستوں میں بیٹھنا لوگوں کو اذیت دینے اور بے حیائی کی طرف لے جانے کا باعث بن سکتا ہے۔

(۱۲) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کسی وقتی ضرر کو دور کرنے اور جزئی مصلحت کے حصول کے لیے کوئی حکم جاری کرتے تھے۔ مثلاً اللہ کے رسول ﷺ نے ایک دفعہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ قربانی کے جانوروں کا گوشت تین دن سے زائد استعمال نہ کریں۔ بعض صحابہؓ نے اس حکم کو آپ ﷺ کا ایک مستقل حکم سمجھ لیا' حالانکہ آپؐ نے یہ حکم ان غریب بدو صحابہؓ کی وجہ سے جاری کیا تھا جو اُس عید کے

موقع پر آپؐ کے ساتھ حاضر تھے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اپنے اس حکم سے مقصود یہ تھا کہ لوگ قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے کی بجائے ان بدو صحابہؓ پر صدقہ کر دیں۔ حضرت سالمؒ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَھٰی اَنْ تُؤْکَلَ لُحُوْمُ الْاَضَاحِیْ بَعْدَ ثَلَاثٍ ، قَالَ سَالِمٌ فَکَانَ ابْنُ عُمَرَ لَا یَاْکُلُ لُحُوْمَ الْاَضَاحِیْ فَوْقَ ثَلَاثٍ(۸۲)

''اللہ کے رسول ﷺ نے قربانی کا گوشت تین دن کے بعد کھانے سے منع کر دیا۔ حضرت سالمؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تین دن کے بعد قربانی کا گوشت نہ کھاتے تھے''۔

حضرت علیؓ کا بھی یہی موقف تھا' جیسا کہ امام نوویؒ نے 'شرح مسلم' میں بیان کیا ہے۔ جبکہ باقی صحابہؓ اس حکم کو ایک مستقل حکم نہیں مانتے اور جمہور علماء کا بھی یہی موقف ہے۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ سے جب اس بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک سال بدو صحابہؓ کی وجہ سے تین دن سے زائد قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع کیا تھا تا کہ لوگ اس کو صدقہ کریں' لیکن اگلے سال آپؐ نے لوگوں کو تین دن سے زائد بھی قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے کی اجازت دے دی۔ روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا نَھَیْتُکُمْ مِنْ اَجْلِ الدَّافَّةِ الَّتِیْ دَفَّتْ' فَکُلُوْا وَادَّخِرُوْا وَتَصَدَّقُوْا)) (۸۳)

''میں نے تم کو تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے بعض بدو صحابہؓ کی وجہ سے منع کیا تھا جو کہ ہمارے پاس آ گئے تھے۔ اب تم تین دن کے بعد بھی کھاؤ' ذخیرہ کرو اور صدقہ بھی کرو''۔

اسی طرح صحیحین میں ایک روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور صحابہؓ نے اس پر عمل بھی کیا' یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مدینہ کے قرب و جوار میں ہم نے کوئی کتا نہ چھوڑا۔ اسی حدیث کی بنیاد پر مالکیہ کے نزدیک کتوں کو قتل کرنا ایک شرعی حکم ہے جو کہ اب بھی جاری ہے' جبکہ شوافع کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی دلیل صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے' جس کے مطابق آپؐ نے بعد میں کتوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا تھا۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک خاص وقت میں مدینہ اور اس کے اردگرد کے کتوں کو قتل کرنے کا جو حکم دیا وہ نہ تو کوئی شرعی حکم تھا اور نہ وہ منسوخ ہوا' بلکہ آپؐ کے زمانے میں پاگل کتوں کی تعداد بڑھ گئی جس کی وجہ سے آپؐ نے صحابہؓ کو کتوں کو مارنے کا حکم دیا تا کہ مسلمانوں کو ضرر سے بچایا جا سکے۔ بعد میں جب کافی تعداد میں کتے مارے گئے تو آپؐ نے صحابہؓ کو مزید کتوں کو مارنے سے منع کر دیا۔ لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ کا اصل مقصود مسلمانوں کو ضرر سے بچانا تھا نہ کہ کوئی شرعی حکم جاری کرنا اور پھر اس کو منسوخ کرنا۔ جیسا کہ ایک صحیح روایت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے حدودِ حرم میں جن پانچ چیزوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے ان

میں ایک 'الکلب العقور' یعنی پاگل کتا بھی ہے۔

(۱۳) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے احکامات بظاہر مطلق ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ مطلق نہیں ہوتے۔ ایسے احکامات اپنے اطلاق میں سنت نہیں ہوں گے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ:

كَانَتْ تَحْتِي امْرَأَةٌ أُحِبُّهَا وَكَانَ أَبِي يَكْرَهُهَا فَأَمَرَنِي أَبِي أَنْ أُطَلِّقَهَا فَأَبَيْتُ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: ((يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ طَلِّقِ امْرَأَتَكَ)) (۸۴)

''ایک خاتون میرے نکاح میں تھیں اور مجھے اس سے محبت تھی' لیکن میرے والد (یعنی حضرت عمرؓ) کو وہ خاتون ناپسند تھیں' تو میرے والد نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کو طلاق دے دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ پھر میں نے اللہ کے نبی ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے عبداللہ بن عمر! اپنی بیوی کو طلاق دے دو''۔

اس روایت کو امام ترمذیؒ نے 'حسن صحیح' کہا ہے۔ (۸۵) امام ابن العربی نے 'صحیح' اور 'ثابت' کہا ہے۔ (۸۶) علامہ البانیؒ نے 'حسن' کہا ہے۔ (۸۷) شیخ احمد شاکر نے اس کی سند کو 'صحیح' کہا ہے۔ (۸۸)

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ اس بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: ((أَطِعْ أَبَاكَ)) (۸۹) یعنی اپنے باپ کی اطاعت کر۔ اب اس روایت سے یہ مسئلہ نکالنا کہ اگر باپ اپنے بیٹے کو یہ حکم دے کہ اپنی بیوی کو طلاق دو تو اس مسئلے میں باپ کی اطاعت مطلقاً واجب ہے' درست نہیں ہے۔ 'تحفۃ الاحوذی' اور 'نیل الاوطار' کے مصنفین نے اس حدیث کو دلیل بناتے ہوئے لکھا ہے کہ باپ کے حکم پر بیٹے کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے چاہے کوئی شرعی عذر ہو یا نہ ہو اور اگر ماں بیوی کو طلاق کا حکم دے تو تین گنا زیادہ واجب ہے' کیونکہ حدیث میں ماں کا حق تین گنا زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ موقف درست نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس دو بدو آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے اونٹ کی تلاش میں ایک قبیلے میں جا نکلا اور وہاں ایک لڑکی مجھے پسند آ گئی تو میں نے اس سے شادی کر لی' لیکن میرے والدین نے قسم اٹھا کر یہ بات کی ہے کہ وہ اس لڑکی کو اپنے خاندان میں شامل نہیں کریں گے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس بدو سے کہا:

مَا أَنَا بِالَّذِي آمُرُكَ أَنْ تُطَلِّقَ امْرَأَتَكَ وَلَا أَنْ تَعُقَّ وَالِدَيْكَ، قَالَ فَمَا أَصْنَعُ بِهٰذِهِ الْمَرْأَةِ؟ قَالَ ابْرُرْ وَالِدَيْكَ (۹۰)

''میں تمہیں نہ تو یہ حکم دیتا ہوں کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو اور نہ ہی یہ مشورہ کہ تم اپنے والدین کی نافرمانی کرو۔ تو وہ شخص کہنے لگا کہ میں پھر اس عورت کا کیا کروں؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا: اپنے والدین سے حسن سلوک کرو''۔

اسی طرح حضرت ابودرداءؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرا باپ پہلے مجھے ایک لڑکی کے ساتھ شادی پر مجبور کرتا رہا اور جب میں نے اس سے شادی کر لی تو اب مجھے حکم دیتا ہے کہ میں اسے طلاق دے دوں۔ تو حضرت ابودرداءؓ نے کہا:

مَا أَنَا بِالَّذِیْ آمُرُكَ أَنْ تَعُقَّ وَالِدَكَ وَلَا أَنَا بِالَّذِیْ آمُرُكَ اَنْ تَعُقَّ امْرَاَتَكَ غَیْرَ إِنَّكَ إِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ :((اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَحَافِظْ عَلٰی ذٰلِكَ إِنْ شِئْتَ أَوْ دَعْ)) (۹۱)

''میں تمہیں نہ تو یہ حکم دیتا ہوں کہ تم اپنے والدین کی نافرمانی کرو اور نہ ہی یہ مشورہ کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں اللہ کے رسول ﷺ کی ایک حدیث بیان کر دیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''باپ جنت کے دروازوں میں سے درمیانی دروازہ ہے۔ اگر تو چاہے تو اس کی حفاظت کر اور اگر چاہے تو اس کو چھوڑ دے''۔

علامہ البانیؒ نے اس حدیث کو 'صحیح' کہا ہے۔ (۹۲)

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ سے جب اس مسئلے کے بارے میں سوال ہوتو آپؒ نے سائل سے کہا: اپنی بیوی کو طلاق مت دے۔ اس پر سائل نے جواباً حضرت عبداللہ بن عمرؓ والا مذکورہ بالا واقعہ سنا دیا تو امام احمدؒ نے جواب دیا:

إِذَا كَانَ أَبُوْكَ مِثْلَ عُمَرَ فَطَلِّقْهَا (۹۳)

''اگر تیرا باپ بھی حضرت عمرؓ کی طرح ہے تو اپنی بیوی کو طلاق دے دے''۔

سعودی علماء کی کمیٹی 'فتاوی اللجنة الدائمة' سے جب اس بارے میں سوال ہوا تو علماء نے یہ جواب دیا:

عليك إقناع والدك بعدم طلق زوجتك' فإن أصر وجب عليك أن تطلقها إذا كان ذلك لأمر شرعي' أما إن كان أمره بطلاقها بغير مسوغ شرعي فإنه لا يلزمك طاعته في ذلك؛ لقول النبي ﷺ :((إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ)) (۹۴)

''تمہارے لیے لازم ہے کہ اپنے والدین کی بات نہ مانو اور بیوی کو طلاق نہ دو لیکن اگر والدین بیوی کو طلاق دینے پر اصرار کریں اور کسی شرعی عیب کی وجہ سے یہ حکم دے رہے ہوں تو ان کی بات مان لو۔ لیکن اگر کسی شرعی سبب کے بغیر طلاق کا حکم دیں تو ان کی اطاعت لازم نہیں ہے' کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اطاعت صرف معروف میں ہے''۔

اسی طرح داڑھی کے بارے میں بعض روایات میں 'أَعْفُوا اللِّحٰی' 'وَوَفِّرُوا اللِّحٰی' 'وأَرْخُوا اللِّحٰی' کے جو الفاظ آئے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ امر مطلق ہے؟ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ ان احادیث میں امر کا صیغہ وجوب کے لیے ہے' لیکن کیا مطلق طور پر داڑھی کو چھوڑنا واجب ہے یا کسی حد تک

چھوڑنا واجب ہے؟ بعض علماء کے نزدیک داڑھی کو اس کی حالت پر چھوڑنا واجب ہے اور اس میں سے کچھ بھی کتر بیونت جائز نہیں ہے۔ علماء کی یہ جماعت آپ ﷺ کے حکم کو اس کے اطلاق پر باقی رکھتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے فعل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی داڑھی کی کبھی تراش خراش نہیں کی، لیکن بعض صحابہؓ سے ملتا ہے کہ انہوں نے ایک مشت سے زائد اپنی داڑھی کی تراش خراش کی ہے، جس سے ثابت ہوا کہ ان صحابہؓ کے نزدیک آپ ﷺ کا داڑھی رکھنے کا حکم تو وجوب کے لیے تھا لیکن وہ حکم اپنے اطلاق میں واجب نہ تھا۔ حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

((خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوا اللِّحٰى وَاحْفُوا الشَّوَارِبَ)) وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَمَا فَضُلَ أَخَذَهُ(۹۵)

''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کم کرو''۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب حج یا عمرہ کرتے تھے تو اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیتے تھے اور جو بال مٹھی سے زائد ہوتے تھے ان کو کاٹ دیتے تھے''۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کو مطلقاً واجب نہ سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک اور شخص کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا، یعنی اس کی داڑھی کی تراش خراش کی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے بھی داڑھی کی تراش خراش ثابت ہے۔ اس کی تفصیل 'فتح الباری' میں موجود ہے۔ سنن ابی داؤد کی ایک 'حسن' روایت کے مطابق حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ ہم (یعنی صحابہؓ) حج اور عمرہ کے علاوہ داڑھی چھوڑے رکھتے تھے، یعنی حج اور عمرہ کے موقع پر ہم داڑھی کی تراش خراش کر لیتے تھے۔

(۱۴) بعض اوقات بعض مخصوص حالات میں اللہ کے رسول ﷺ کے حکم پر عمل کرنے میں کسی فتنے کا اندیشہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض علماء کے نزدیک ان حالات میں آپؐ کے اس حکم پر عمل کرنا سنت پر عمل شمار نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ ﷺ کا حکم ہے:

((لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ)) (۹۶)

''اللہ کی بندیوں (یعنی اپنی بیویوں) کو مسجدوں میں جانے سے مت روکو''۔

اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان کے باوجود حضرت عمرؓ اپنی بیوی کے مسجد جانے کو ناپسند کرتے تھے اور بعض اوقات اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی بیوی سے کہا گیا:

لِمَ تَخْرُجِيْنَ وَقَدْ تَعْلَمِيْنَ أَنْ عُمَرَ يَكْرَهُ ذٰلِكَ وَيَغَارُ؟ (۹۷)

''آپ مسجد کے لیے گھر سے کیوں نکلتی ہیں جبکہ آپ جانتی ہیں کہ حضرت عمرؓ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اس بات پر غیرت کھاتے ہیں؟''

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنے زمانے کے فتن کو دیکھا تو کہا:

لَوْ أَدْرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ (۹۸)

''اگر اللہ کے رسول ﷺ آج کل کی عورتوں کے حالات دیکھتے تو عورتوں کو مسجد میں جانے سے روک دیتے جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا''۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب اپنے بیٹے بلالؒ کو اللہ کے رسول ﷺ کی یہ روایت سنائی کہ اپنی بیویوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو تو حضرت بلالؒ نے جواباً کہا:

وَاللّٰهِ لَنَمْنَعُهُنَّ، فَقَالَ لَهُ عَبْدُ اللّٰهِ أَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَتَقُوْلُ اَنْتَ لَنَمْنَعُهُنَّ؟ (۹۹)

''اللہ کی قسم ہم تو ان کو منع کریں گے''۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: ''میں تم سے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث بیان کرتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ہم منع کریں گے؟''

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت بلالؒ نے اپنے والد کو کہا کہ ہمارے زمانے میں عورتیں اگر مسجد میں جائیں گی تو فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا ہم انہیں مسجد میں جانے سے روکیں گے۔ باوجودیکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت بلالؒ کو ان کے اس جواب پر سرزنش کی ☆ لیکن خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی شرعی احکام پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس اصول (یعنی سدالذرائع) کو مدنظر رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے بیٹے نے اس حدیث پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے دورِ خلافت میں حجاج بن یوسف ثقفی کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی حجاز میں قائم شدہ خلافت کو ختم کرنے کے لیے بھیجا۔ اس وقت دو افراد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

إِنَّ النَّاسَ صَنَعُوْا وَأَنْتَ ابْنُ عُمَرَ وَصَاحِبُ النَّبِيِّ ﷺ فَمَا يَمْنَعُكَ أَنْ تَخْرُجَ؟ فَقَالَ يَمْنَعُنِيْ أَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ دَمَ أَخِيْ فَقَالَا أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ فَقَالَ قَاتَلْنَا حَتّٰى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ وَكَانَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ وَأَنْتُمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تُقَاتِلُوْا حَتّٰى تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِغَيْرِ اللّٰهِ؟ (۱۰۰)

''لوگوں نے امانت کو ضائع کر دیا (یعنی حق دار کو امارت و خلافت عطا نہ کی) اور آپؓ حضرت عمرؓ کے

☆ بعض روایات میں ہے کہ سیدنا ابن عمرؓ اپنے بیٹے پر سخت ناراض ہوئے تھے اور آخر عمر تک اس سے بات نہ کی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بیٹے کا اسلوب مناسب نہ تھا۔ حدیث سننے کے بعد اس طرح کا ردِ عمل نہیں ہونا چاہیے کہ انسان اس کو سنتے ہی رد کر دے، بلکہ اس پر عمل نہ کرنے کا جواز حدیث کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے علمی انداز سے پیش کرنا چاہیے۔

بیٹے ہیں' اللہ کے رسول ﷺ کے صحابیؓ بھی ہیں' پھر بھی آپ ان ظالم حکمرانوں کے خلاف خروج کیوں نہیں کرتے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا مجھے اللہ کا یہ حکم ان کے خلاف خروج سے روکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان بھائی کے خون کو حرام کیا ہے۔ تو اس شخص نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا کہ ان سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے؟ (یعنی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو بنوامیہ کے فتنے سے نکالنے کے لیے قتال ہونا چاہیے) تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جواب دیا: ہم نے قتال کیا تھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور دین (یعنی اطاعت) اللہ ہی کے لیے ہو گیا اور تم یہ چاہتے ہو کہ تم قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے؟''

صحیح بخاری ہی کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے آ کر کہا کہ آپ ہر سال حج و عمرہ تو کرتے ہیں لیکن اللہ کے راستے میں جہاد نہیں کرتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: ارکان اسلام پانچ ہی ہیں' یعنی جہاد ان میں شامل نہیں ہے۔ تو اس شخص نے کہا اللہ تعالیٰ نے تو یہ حکم دیا کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ اور اگر پھر ان میں کوئی ایک زیادتی کرے تو اس کے خلاف لڑو۔ یہ شخص دراصل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہہ رہا تھا کہ ﴿فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ﴾ (الحجرات:۹) کی نص کے تحت آپ پر ظالم گروہ کے ساتھ قتال واجب ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسے وہ جواب دیا جو اوپر مذکور ہے۔

(۱۶) بعض اوقات کوئی امتی آپ ﷺ کے حکم کے ظاہر کی بجائے آپؐ کے مقصود و منشا کو ملحوظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے آپؐ کے ظاہری حکم پر عمل نہیں ہوتا۔ اس صورت میں آپؐ کے ظاہری حکم پر عمل نہ کرنا افضل ہوتا ہے اگرچہ ظاہری حکم پر عمل بھی درست ہوتا ہے۔ مثلاً غزوۂ احزاب کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے بنوقریظہ سے ان کی بدعہدی کا بدلہ لینے کے لیے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ بنوقریظہ کی طرف کوچ کریں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں میں یہ منادی کرائی کہ:

((لَا یُصَلِّیَنَّ أَحَدٌ الظُّهْرَ إِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَةَ)) فَتَخَوَّفَ نَاسٌ فَوْتَ الْوَقْتِ فَصَلُّوْا دُوْنَ بَنِیْ قُرَیْظَةَ' وَقَالَ آخَرُوْنَ لَا نُصَلِّیْ إِلَّا حَیْثُ أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَإِنْ فَاتَنَا الْوَقْتُ' قَالَ : فَمَا عَنَّفَ وَاحِدًا مِنَ الْفَرِیْقَیْنِ (۱۰۱)

''تم میں کوئی بھی اُس وقت تک ظہر کی نماز ہرگز نہ پڑھے جب تک کہ وہ بنوقریظہ میں نہ پہنچ جائے''۔ تو بعض لوگوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ (بنوقریظہ تک پہنچتے پہنچتے) ہماری نماز کا وقت فوت ہو جائے گا تو انہوں نے بنوقریظہ پہنچنے سے پہلے ہی (راستے میں) نماز پڑھ لی' جبکہ صحابہؓ کے ایک دوسرے گروہ نے کہا کہ ہم اسی جگہ ظہر کی نماز پڑھیں گے جہاں اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے چاہے ہماری نماز کا وقت ہی کیوں نہ گزر جائے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے دونوں گروہوں کے عمل کا تذکرہ کیا گیا تو آپؐ نے کسی گروہ کے فعل کا انکار نہیں کیا''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ کے ظاہری حکم کی جن صحابہؓ نے یہ تأویل کی تھی کہ آپؐ کا اس حکم سے اصل مقصود یہ تھا کہ بنو قریظہ تک جلدی پہنچو یہاں تک کہ ظہر کی نماز وہاں جا کر پڑھو، وہ تأویل درست تھی اور آپؐ نے ان کے اس فعل کی اپنی تقریر کے ذریعے تصویب فرمائی۔ علاوہ ازیں راستے میں نماز پڑھنے والا گروہ اس لیے افضل ہے کہ اس نے قرآن کے حکم ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ پر بھی عمل کیا۔

(۱۷) بعض اوقات کوئی عالم نبی اکرم ﷺ کے کسی حکم کی یہ تأویل کرتا ہے کہ وہ لازمی حکم نہیں ہے لہٰذا وہ اس حکم پر عمل نہیں کرتا۔ مثلاً حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علیؓ بن ابی طالب نے مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والا معاہدہ لکھا اور اس میں 'مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ' کے الفاظ لکھے تو اس پر مشرکین نے اعتراض کیا کہ یہ الفاظ معاہدے میں نہ لکھے جائیں، کیونکہ اگر ہم آپؐ کو اللہ کا رسول مانتے تو آپؐ سے جنگ نہ کرتے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

((اُمْحُہٗ)) فَقَالَ عَلِیٌّ مَا اَنَا بِالَّذِیْ اَمْحَاہُ، فَمَحَاہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِیَدِہٖ[۱۰۲]

''ان الفاظ کو مٹا دو''۔ حضرت علیؓ نے کہا: میں ان الفاظ کو مٹانے والا نہیں ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے مٹا دیے''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے میں آپؐ کے حکم کی تعمیل کو آپؐ کی محبت اور اپنے ایمان کے منافی سمجھا لہٰذا انہوں نے اس پر عمل نہ کیا اور آپؐ کے حکم کی یہ تأویل کی کہ وہ کوئی لازمی حکم نہیں ہے۔ امام نوویؒ نے 'شرح مسلم' میں اس حدیث کی یہی تأویل بیان کی ہے۔ اس طرح کی اور بھی بیسیوں روایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ و تابعینؒ نے آپؐ کے ہر حکم کی اتباع کو لازم نہیں سمجھا اور نہ ہی وہ آپؐ کے ہر قول کو شریعت سمجھتے تھے۔ لیکن یہ فرق کرنا کہ آپؐ کے کون سے اقوال کا تعلق تشریع سے ہے اور کون سے اقوال ہمارے لیے شریعت نہیں ہیں، یہ کسی عام آدمی کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ان علماء کا کام ہے جن کی زندگیاں حدیث پڑھنے اور پڑھانے میں گزرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ائمہ سلف میں شارحین حدیث اور فقہاء و محدثین نے یہ کام بحسن وخوبی کیا ہے اور حدیث کی شرح میں جا بجا یہ واضح کیا ہے کہ آپؐ کا یہ حکم وجوب کے لیے ہے یا استحباب کے لیے، اباحت کے لیے ہے یا منسوخ ہے، عام ہے یا خاص، مستقل ہے یا عارضی، مطلق ہے یا مقید، وغیرہ۔

اس مضمون کی اگلی قسط میں ہم اِن شاء اللہ رسول اکرم ﷺ کے افعال اور اتباع کے حوالے سے بحث کریں گے۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب التقاط الحصی۔

(۲) اقتضاء الصراط المستقیم: جلد۱، ص ۳۲۷۔ (۳) المجموع: جلد۸، ص ۱۷۱۔

(٤) صحیح النسائی: ۳۰۵۷۔

(٥) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم۔

(٦) لسان العرب:باب س۔ن۔ن۔ (۷) تاج العروس: باب س۔ن۔ن۔

(۸) النهایة فی غریب الحدیث: باب السین مع النون۔

(۹) المفردات:باب س۔ن۔ن۔

(۱۰) معجم مقاییس اللغة: باب س۔ن۔ن (۱۱) اصول الفقه الإسلامی: ص ٤٥۰۔

(۱۲) اصول الفقه الاسلامی:ص ٤٥۰۔ (۱۳) الوجیز:ص۳۹۔

(۱٤) الوجیز:ص۳۹۔ (۱٥) اصول الفقه الاسلامی:۷۸۔

(۱٦) اصول الفقه الاسلامی:۷۹۔ (۱۷) الوجیز:ص۳۹۔

(۱۸) علوم الحدیث فی ضوء تطبیقات المحدثین النقاد:ص۱٥، ۱٦۔

(۱۹) الوجیز: ص۱٦۱، ۱٦۲۔

(۲۰) سنن ابی داوٗد، کتاب العلم، باب فی کتاب العلم۔

(۲۱) فتح الباری، جلد۱، ص ۲٥۰۔ (۲۲) صحیح ابی داوٗد:۳٦٤٦۔

(۲۳) الوجیز:ص۱٦٤، ۱٦٥۔ (۲٤) المعجم الطبرانی، جلد ٥، ص ۱٤۰۔

(۲٥) مجمع الزوائد: جلد۹، ص ۲۰۔ (۲٦) هدایة الرواة:جلد ٥ ص۲۸٦۔

(۲۷) الشمائل المحمدیة:۲۹٤۔

(۲۸) صحیح البخاری، کتاب العلم،باب الانصات للعلماء۔

(۲۹) شرح عقیدة طحاویة لابن ابی العز الحنفی متوفی ۹۷۲هـ، ص۳۰۳، ۳۰٤۔

(۳۰) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برأیه۔

(۳۱) هدایة الرواة: جلد۱،ص ۱٥۸۔ (۳۲) فتاوی ابن الصلاح:۲٦۔

(۳۳) عمدة التفسیر: جلد۱، ص٤٥۔ (۳٤) ضعیف الترمذی:۲۹٥۲۔

(۳٥) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب من کفر أخاه بغیر تأویل فهو کما قال۔

(۳٦) سنن ابی داوٗد، کتاب الأدب، باب فی النهی عن البغی۔

(۳۷) صحیح ابی داوٗد:٤٤۰۱۔ (۳۸) عمدة التفسیر:جلد۱، ص٥۲۲۔

(۳۹) سنن أبی داوٗد، کتاب النکاح، باب ما یؤمر به من غض البصر۔

(٤۰) مجموع الفتاوی:جلد۲۲، ص۱۲۸۔ (٤۱) صحیح ابی داوٗد:۲۱٤۸۔

(٤٢) اصول فقہ پر ایک نظر: ص۲۰۔
(٤٣) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب إذا دخل أحدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل أن یجلس۔
(٤٤) فتح الباری مع صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب إذا دخل أحدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل أن یجلس۔
(٤٥) صحیح البخاری' کتاب اللباس' باب الخضاب۔
(٤٦) فتح الباری مع صحیح البخاری' کتاب اللباس' باب الخضاب۔
(٤٧) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' باب نھی النبی علی التحریم إلا ما تعرف اباحتہ۔
(٤٨) فتح الباری مع صحیح البخاری۔
(٤٩) صحیح البخاری' کتاب أحادیث الأنبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔
(٥٠) فتح الباری مع صحیح البخاری' کتاب أحادیث الأنبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔
(٥١) الوجیز: ص٤٨۔
(٥٢) صحیح مسلم' کتاب اللباس والزینۃ' باب استحباب لبس النعل فی الیمنی اولاً والخلع من الیسریٰ۔
(٥٣) شرح النووی مع صحیح مسلم' کتاب اللباس والزینۃ' باب استحباب لبس النعل فی الیمنی اولاً۔
(٥٤) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب کراھیۃ التمنی لقاء العدو۔
(٥٥) الوجیز: ص٥٤۔
(٥٦) صحیح مسلم' کتاب النکاح' باب تحریم الخطبۃ علی خطبۃ اخیہ حتی یاذن او یترک۔
(٥٧) شرح النووی مع صحیح مسلم' کتاب النکاح' باب تحریم الخطبۃ علی خطبۃ اخیہ حتی یاذن او یترک۔
(٥٨) اصول فقہ پر ایک نظر' ص۲۹۔
(٥٩) صحیح مسلم' کتاب الحیض' باب الوضوء مما مست النار۔
(٦٠) سنن الترمذی' کتاب الطھارۃ عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی الوضوء مما غیرت النار۔
(٦١) صحیح الترمذی: ٧٩۔ (٦٢) شرح سنن الترمذی' ج١' ص ١٤٤۔
(٦٣) سنن النسائی' کتاب الطھارۃ' باب ترک الوضوء مما غیرت النار۔
(٦٤) المجموع' ج٢' ص ٥٦۔ (٦٥) موافقۃ الخبر الخبر: جلد٢' ص٢٧٣۔
(٦٦) البدر المنیر: جلد٢' ص٤١٢۔ (٦٧) شرح معانی الآثار: جلد١' ص٦٧۔
(٦٨) المحلی: جلد١' ص٢٤٣۔ (٦٩) المغنی: جلد١' ص٢٥۔
(٧٠) صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا دون ما ذکرہ من معایش۔
(٧١) سنن ابی داؤد' کتاب الطلاق' باب فی المملوکۃ تعتق وھی تحت حر او عبد۔
(٧٢) المحلی: جلد٩' ص٢٣٤۔ (٧٣) مجموع الفتاویٰ: جلد١' ص٣١٧۔
(٧٤) صحیح ابی داؤد: ٢٢٣١۔ (٧٥) مسند احمد' جلد٣' ص٢٥٤۔

(٧٦) صحیح البخاری' کتاب الشهادات' باب من اقام البینة بعد الیمین۔وصحیح مسلم' کتاب الاقضیة' باب الحکم بالظاهر واللحن بالحجة۔

(٧٧) صحیح البخاری' کتاب الاضاحی' باب قول النبیﷺ لابی بردة ضح بالجذع من المعز۔ وصحیح مسلم' کتاب الاضاحی' باب وقتها۔

(٧٨) صحیح مسلم' کتاب الرضاع' باب رضاعة الکبیر۔

(٧٩) سنن ابی داؤد' کتاب النکاح' باب فیمن حرم به ۔

(٨٠) صحیح ابی داؤد: ٢٠٦١۔

(٨١) صحیح مسلم' کتاب اللباس والزینة' باب النهی عن الجلوس فی الطرقات واعطاء الطریق حقه۔

(٨٢) صحیح مسلم' کتاب الاضاحی' باب بیان ما کان من النهی عن اکل لحوم الاضاحی۔

(٨٣) صحیح مسلم' کتاب الاضاحی' باب بیان ما کان من النهی عن اکل لحوم الاضاحی۔

(٨٤) سنن الترمذی' کتاب الطلاق واللعان عن رسول اللهﷺ ' باب ماجاء فی الرجل یساله ابوه ان یطلق زوجته۔

(٨٥) سنن الترمذی: ١١٨٩۔

(٨٦) عارضة الاحوذی' ج٣' ص ١٣٥۔

(٨٧) صحیح الترمذی: ١١٨٩۔

(٨٨) مسند احمد' ج٧' ص ١٣٢۔

(٨٩) مسند احمد: ٤٤٨١۔

(٩٠) مصنف ابن ابی شیبة' ج٤' ص ١٧٣۔

(٩١) صحیح ابن حبان' جلد٢' ص١٦٧۔

(٩٢) صحیح الترغیب:٢٤٨٦۔

(٩٣) فتاوی الأزهر' جلد ٩' ص٤٣٩۔

(٩٤) فتاوی الجنة الدائمة' جلد ٢٠' ص٣٢۔

(٩٥) صحیح البخاری' کتاب اللباس' باب تقلیم الأظافر۔

(٩٦) صحیح مسلم' کتاب الصلاة' باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یترتب علیه الفتنة۔

(٩٧) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب هل علی من لم یشهد الجمعة غسل من النساء والصبیان۔

(٩٨) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس۔

(٩٩) صحیح مسلم' کتاب الصلاة' باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یترتب علی الفتنة۔

(١٠٠) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قوله وقاتلوهم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین للّٰه۔

(١٠١) صحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب المبادرة بالغزو وتقدیم اهم الامرین المتعارضین۔

(١٠٢) صحیح البخاری' کتاب الصلح' باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان بن فلان وفلان بن فلان۔

❁❁❁